ماہنامہ

ترجمان القرآن

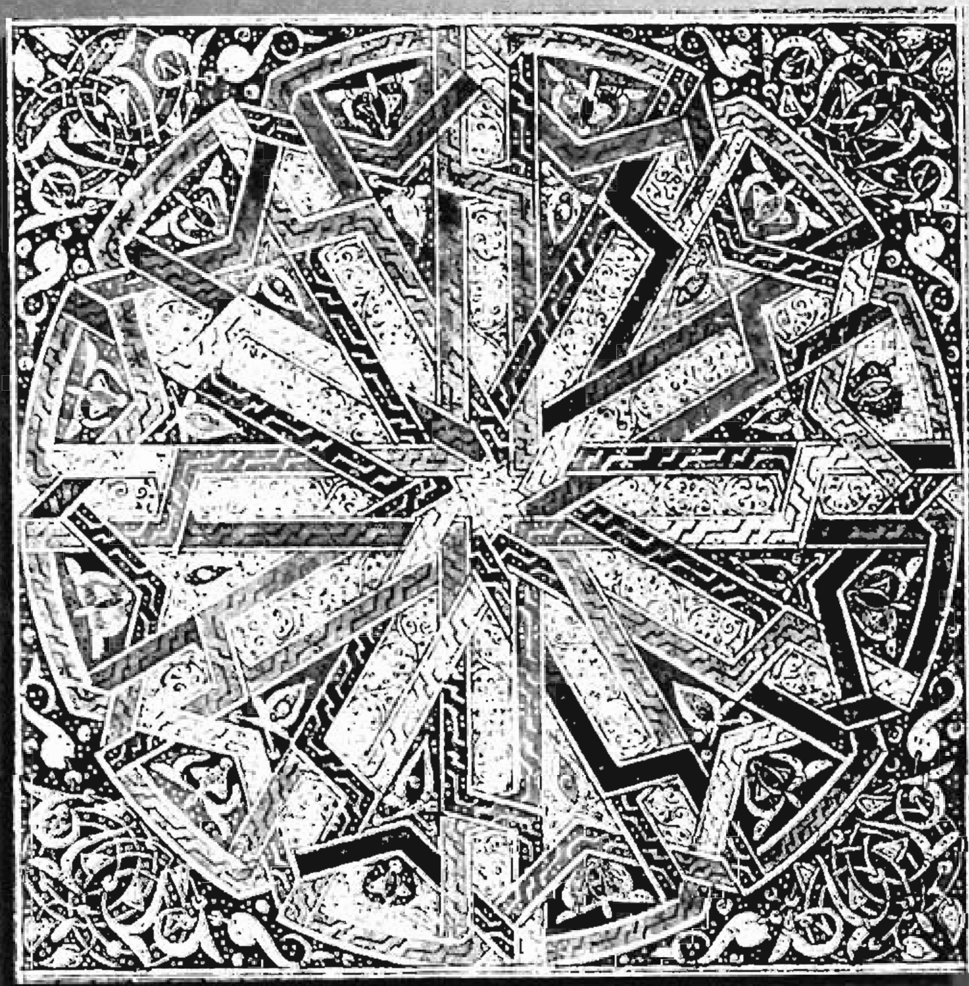
جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

دسمبر ۱۹۹۷

مدیر

خورشید احمد



ادارۂ ترجمان القرآن


اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)
فیملی ولاز راولپنڈی
ہمارے منصوبے
دیکھیں اور
فیصلہ کریں
سب سے بہتر
سب سے سستے
یاسمان ٹاؤن مکمل
ہمارا دعویٰ
فیملی ولاز مری
قاضی
انٹر پرائزز
الرحمٰن ٹاؤن مکمل
محل وقوع
نیو انٹرنیشنل اسلام آباد ایئرپورٹ
گورنمنٹ کی آباد ہاؤسنگ سکیم کے قریب تر
سہولیات
کشادہ سڑکیں سکول کالج ہسپتال ڈاک خانہ
مساجد پارک قبرستان کے لئے جگہ مختص
کردی گئی ہے
طریقہ ادائیگی
نقد ادائیگی پر 10 فیصد رعائت
7000 روپے فی مرلہ
1000 روپے فی مرلہ بوقت بکنگ
100 روپے فی مرلہ ماہانہ قسط
50 فیصد ادائیگی پر فوری رجسٹری
پہلے آیئے ★★★ پہلے پایئے
آپ کا اعتماد
ہمارا سرمایہ
موٹر وے سٹی
تمام ادائیگی بذریعہ ڈرافٹ موٹر وے سٹی اکاؤنٹ 1100
الائیڈ بینک راشد منہاس روڈ راولپنڈی
ترقی کا راستہ
موٹر وے کا راستہ
ترقی کی جانب قدم
موٹر وے سٹی میں گھر
خوش نصیب کون؟
شاید آپ ہوں ....
موٹر وے کے افتتاح کی خوشی میں 31 دسمبر تک
بکنگ کرانے والے حضرات میں پانچ پلاٹ پانچ مرلہ والے
بذریعہ قرعہ اندازی مفت دیے جائیں گے
ایم ڈی :- شوکت محمود قاضی
ہیڈ آفس
قاضی انٹر پرائزز
جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی
فون 554464 فیکس 558633

ماہنامہ
ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد　　　نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۴　　　دسمبر ۱۹۹۷ء شعبان ۱۴۱۸ھ　　　عدد ۱۲

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس: ۷۸۴۴۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے:

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰

بنگلہ دیش، ایران -/۴۵۰

مشرق وسطیٰ، یورپ،

مشرق بعید، افریقہ -/۶۵۰

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

پنجاب کے ضلع گورداس پور میں پٹھان کوٹ ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس سے چند ہی میل کے فاصلے پر کوہستان ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے' اور اس کے قریب ہی وہ مقام واقع ہے' جہاں سے دریاے راوی پہاڑوں کی آغوش سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقے میں آتا ہے۔ مناظر کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت فرحت بخش ہے۔ آب و ہوا اچھی ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ پانی کی افراط ہے۔ قدرت نے میلوں تک جنگلوں کو باغ بنا رکھا ہے۔

اسی علاقے میں پٹھان کوٹ سے چار میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں جمال پور واقع ہے۔ جہاں چند بندگان خدا نے "دارالاسلام" کی بنا رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس غرض کے لیے ساٹھ ستر ایکڑ زمین حاصل کر لی گئی ہے جو راہ خدا میں وقف ہے۔ ایک مسجد' ایک کتب خانے کی عمارت' ایک دارالاقامہ (جو بیس پچیس آدمیوں کے لیے کافی ہو سکتا ہے) اور دو مکان تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ سردست کام کرنے کی ابتدا کرنے کے لیے اتنی عمارتیں کافی ہیں۔ زمین وقف میں اتنی گنجایش ہے کہ آیندہ جیسی ضروریات پیش آئیں' ان کے مطابق جدید عمارتیں بنا لی جائیں۔ نیز اطراف و اکناف میں پھیلنے کے لیے بھی بہت کافی جگہ موجود ہے اور وقف کی زمین اتنی زرخیز و شاداب ہے کہ اگر اسے صحیح طریقے پر استعمال کیا جائے تو پانچ چھ ہزار روپیہ سالانہ آمدنی دے سکتی ہے۔ یہ ان ابتدائی کاموں کے لیے کافی ہے جو پیش نظر ہیں۔ شہری آبادیوں سے یہ جگہ بھی دور ہے اور یہاں وہ آسانیاں بھی بہم پہنچ سکتی ہیں جو شہری زندگی کے لیے درکار ہیں۔ ریلوے اسٹیشن سرنا (جو امرتسر پٹھان کوٹ لائن پر واقع ہے) یہاں سے صرف دس منٹ کی مسافت پر ہے۔ قریب ہی سے برق آبی (ہائیڈرو الیکٹرک سسٹم) کا سلسلہ گزرا ہے جس سے ضرورت کے وقت نہایت سستی بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف ایک بہت بڑی نہر (جس میں پورا دریاے راوی منتقل کر دیا گیا ہے) زمین وقف سے متصل ہو کر ہی گزری ہے۔ اور یہ پانی حاصل کرنے کا ایسا ذریعہ ہے جو تمام ضروریات کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ غرض یہاں ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں' اور اس کے ساتھ یہ مقام شہری آبادیوں سے اتنی دور ہے کہ ہم کو ایک آزاد ماحول میسر آ سکتا ہے جس میں ہم اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں۔

(ابوالاعلیٰ مودودی' دارالاسلام' ترجمان القرآن' جلد ۱۱' عدد ۴' شوال ۱۳۵۶ھ' دسمبر ۱۹۳۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

حکومت عدلیہ کشمکش اور جمہوریت کا مستقبل

خورشید احمد

پاکستانی قوم گذشتہ اڑھائی تین مہینے سے جس کرب ناک آئینی بحران سے دوچار ہے وہ ہماری سیاسی قیادت کے فکری اور اخلاقی افلاس کا آئینہ دار ہے۔ آزادی کے پچاس سال بعد اور سیاسی در و بست کے بار بار بگڑنے اور تلخ تجربے کرنے کے باوجود جس سہل انگاری' عاقبت نااندیشی اور ایک گونہ انانیت کے ساتھ نہایت بنیادی' دستوری اور اداراتی امور سے کھیلا گیا ہے' وہ سخت پریشان کن ہے۔ بظاہر پانچ ججوں کے سپریم کورٹ میں تقرر سے بادل چھٹنے اور گرد بیٹھ جانے کا تاثر دیا جا رہا ہے لیکن گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ کش مکش ایک ذرا مستور شکل میں برابر جاری ہے اور ملک و ملت کے بہی خواہ سرگراں ہیں کہ ؏

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین

یہی وہ حالات ہیں جو اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ مسئلے کا بے لاگ اور معروضی جائزہ لیا جائے اور ان حقیقی اسباب و عوامل کی نشان دہی کی جائے جو بگاڑ کے ذمہ دار ہیں۔ مسئلہ محض "مشیروں" کے غلط مشوروں کا نہیں کہ اس کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ اصل ذمہ داری مشیروں کے انتخاب اور تقرر کرنے والوں اور ان کے مشوروں پر عمل کرنے والوں کی ہوتی ہے اور "بندر کی بلا طویلے کے سر" والا رویہ نہ صرف یہ کہ غیر حقیقت پسندانہ ہے بلکہ خود فریبی اور تباہی کا راستہ ہے۔

---

۲۰ مارچ ۱۹۹۶ پاکستان کی سیاسی اور آئینی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روز سپریم کورٹ نے اپنے ایک تاریخی فیصلے کے ذریعے ملک کے دستوری ڈھانچے کو ایسی بنیادوں پر مستحکم کرنے کی کوشش کی جو جمہوریت کے مستقبل اور قانون کی حکمرانی کے لیے باب کشا تھا۔ یہ فیصلہ عدالت عالیہ کے فل

بنچ کا متفق علیہ فیصلہ تھا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے سوچ بچار اور کرب و اضطراب سے گزرنے کے بعد سپریم کورٹ نے ملک کی دستوری حکومت کی گاڑی کو پٹڑی پر لانے کے لیے ایک تاریخی اقدام کیا۔ افسوس ہے کہ اس فیصلے کو بھی سیاسی قیادتوں نے اپنے اپنے سیاسی کھیل میں فٹ بال بنانے کی کوشش کی اور اصلاح حال کے لیے جو فیصلہ کن دروبست تجویز کیا گیا تھا' اسے انا اور ذاتی اقتدار کی خاطر سبوتاژ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی اور اب تک اسے دل سے قبول کر کے اس کے مطابق آئینی اداروں کو مستحکم کرنے کی کوئی فکر اور کوشش نظر نہیں آ رہی ہے۔ روشنی کی واحد کرن یہ ہے کہ عدالت عالیہ بڑی حد تک اپنے موقف پر قائم اور مستحکم ہے اور اسے پریس اور پسے ہوئے عوام کی بڑھتی ہوئی تائید حاصل ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اصل مباحث کیا ہیں اور وہ کیا معاملات ہیں جو داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ ہماری نگاہ میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے مستقبل کا انحصار اس بحران سے کامیابی سے عہدہ برآ ہونے پر ہے۔

آمریت' خواہ فوجی ہو یا سول' اختیارات کے ارتکاز اور مرکزیت سے عبارت ہے جب کہ جمہوریت کی بنیاد آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی سیاسی اداروں کے درمیان قوت اور اختیارات کا توازن اور جواب دہی کا مربوط نظام ایک مہذب اور جمہوری معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔ استبداد (tyranny) اور انتشار اور نراج (anarchy) کی دو انتہاؤں سے بچنے کا موثر ترین ذریعہ یہی توازن اختیارات ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشان ہونا

جدید ریاست میں اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف اقتدار کے تینوں مرکزی عضو (organs) پارلیمنٹ' حکومت اور عدلیہ میں تقسیم اختیارات میں مکمل توازن اور مناسب تحدیدات (checks and balances) ہوں تو دوسری طرف عوام میں سیاسی بیداری' ملک میں تنقید و احتساب کی آزادی اور پریس اور میڈیا کو اپنا کردار ادا کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں تاکہ ہر ادارہ اپنے دائرے میں آزادی اور اعتدال کے ساتھ کام کر سکے اور اجتماعی آداب کا پورا پورا احترام کرے۔ کسی ایک کا دوسروں پر حاوی ہو جانا ہی دراصل پورے نظام کو تہ و بالا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

ہمارے ملک کی سیاسی قیادت نے اپنی جمہوریت پسندی کے تمام دعووں کے علی الرغم جس طرح شہریوں کے بنیادی حقوق کو پامال کیا ہے' صحافت اور میڈیا کو لگام دینے کی کوشش کی ہے اسی طرح عدالت کو بھی اپنے قابو میں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس سلسلے میں جو اقدام کیے گئے ان میں عدلیہ کے آئینی

اختیارات کو محدود و مقید کرنا' عدلیہ میں اپنی پسند کے لوگوں کا میرٹ کے اصولوں کو پامال کرتے ہوئے تقرر کرنا' عدلیہ کے "ناپسندیدہ فیصلوں" کو نظرانداز کرنا بلکہ ان کی کھلی خلاف ورزی کرنا' تحقیر کرنا اور انھیں غیر موثر بنانے (undo) کے لیے نت نئے حربے استعمال کرنا اور عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے دستوری تقاضے کو پورا نہ کرنا زیادہ اہم ہیں۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں پیپلزپارٹی کی بے نظیر حکومت کے اس گھناؤنے اقدام نے جس کے ذریعے ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ میں اپنے من پسند ججوں کی تھوک کے حساب سے تقرری' معتبراور تجربہ کار ججوں کی فارغ خطی' سینیر ججوں ہی نہیں ہائی کورٹس کے چیف جسٹس صاحبان تک کی بلامشورہ منتقلی اور شریعت کورٹ میں ان کو dump کرنے کی جسارت کی گئی' عدالت عالیہ کے صبر کے پیمانے کو لبریز کر دیا اور اس نے ملک کے نظام عدل کو بچانے کے لیے ایک فیصلہ کن اقدام کیا--- یعنی ۲۰ مارچ کا فیصلہ۔ اس فیصلے کے ذریعے عدالت نے ملک کے نظام عدل کو دستور کے مطابق تحفظ دینے اور اسے سیاسی قیادت کی دراندازی سے بچانے کے لیے واضح اصول طے کیے جن پر عمل کر کے ملک جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی طرف حقیقی پیش رفت کر سکتا ہے۔ اس فیصلے کو جہاں عوام نے ایک تاریخی سنگ میل سمجھا وہیں وقت کی حکومتوں نے اسے اپنے آمرانہ عزائم کی راہ میں ایک سنگ گراں تصور کیا۔ یہی وہ چیز ہے جو مارچ ۱۹۹۶ سے اب تک حکومت اور عدلیہ کے تصادم کا اصل سبب بنی ہوئی ہے۔ محض خلط مبحث کی خاطر اسے "پارلیمنٹ اور عدلیہ کی کش مکش" یا "پارلیمنٹ کی بالادستی کو خطرہ" قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ اس قوم کا المیہ ہے کہ اس کی دونوں روایتی بڑی پارٹیاں' جن میں سے ایک فیصلے کے وقت برسراقتدار تھی اور دوسری اس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے' اپنے اپنے دور میں اقتدار کے نشہ میں اس فیصلے اور اس کے تقاضوں کو غیر موثر کرنے میں مصروف رہے۔

آیئے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ فیصلہ کیا ہے اور اس کے ذریعے کن اصولوں کو طے اور مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جو بحثیں ملک میں ہو رہی ہیں' ان میں اس فیصلے کے تاریخی مضمرات کا پورا شعور تک موجود نہیں۔

۱- پاکستان محض ایک سیکولر ریاست نہیں بلکہ ایک اسلامی ریاست ہے جو خدا کی حاکمیت اعلیٰ کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس ملک میں تمام امور اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں طے ہونے چاہییں۔ یہ تقاضا ہے قرارداد مقاصد [جو اب دستور کا قابل تنفیذ حصہ ہے ۲ (الف)]' آرٹیکل ۲ جس کی رو سے اسلام ریاست کا دین ہے' آرٹیکل ۲۲۷ جو قرآن و سنت کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اس حلف کا جو صدر' وزیراعظم' چیف جسٹس' وزرا' جج اور ارکان پارلیمنٹ سے لے کر تمام ذمہ دار اٹھاتے ہیں۔ یہی دستور کی سب سے اہم

بنیاد ہے اور اس کے تحت ریاست اور اقتدار ایک امانت (trust) ہے جسے عوام کے نمائندوں کے ذریعے ان حدود میں ادا کیا جائے گا جو اسلام نے طے کی ہیں۔

۲۔ اسلامی ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کا دستور جن بنیادوں کو مزید واضح کرتا ہے' ان کا تعلق ملک کے پارلیمانی جمہوری نظام' وفاقی ہیئت' بنیادی حقوق کے تحفظ اور عدلیہ کی مکمل آزادی سے ہے۔

۳۔ پاکستان کا دستوری ڈھانچہ اقتدار کو تین اداروں میں مکمل توازن کے ساتھ تقسیم کرتا ہے۔ قانون سازی کا حق پارلیمنٹ کا ہے' نظام حکومت کو چلانے کی ذمہ داری انتظامیہ پر ہے جو وزیراعظم' کابینہ اور ماتحت بیوروکریسی پر مشتمل ہے اور قانون کے نفاذ کی نگرانی اور اس کی تعبیر کا اختیار عدالت کو حاصل ہے۔

۴۔ عدلیہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی اس وقت کر سکتی ہے جب وہ مکمل طور پر آزاد ہو' انتظامیہ سے علیحدہ ہو' اس میں تقرری' تنزلی اور تبدیلی کا نظام ایسے شفاف اصولوں پر قائم ہو جن کے تحت انصاف کا حصول ممکن ہو سکے' میرٹ کا اہتمام ہو سکے اور سیاسی عناصر اور مفاد پرستوں کی در اندازیوں کی گنجائش نہ ہو۔

۵۔ ہر اس شخص کو جس کے حقوق پامال ہوئے ہوں یا جو ملک کے اہم معاملات سے متاثر ہو رہا ہو' اسے عدالت تک رسائی کا حق حاصل ہے اور عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ اگر انصاف نہیں ہو رہا ہے' تو وہ خود یا کسی بھی شخص کی درخواست پر موثر کارروائی کرے۔ واضح رہے کہ اس فیصلے کے ذریعے ضمنی طور پر ہی سہی' ایک عام شہری کے دو بڑے بنیادی حق تسلیم کیے گئے ہیں یعنی:

(i) خواہ ایک شخص بلاواسطہ متاثرہ پارٹی (aggrieved party) نہ ہو لیکن اگر بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے تو ہر فرد ذاتی شکایت (grievance) کے بغیر بھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔

(ii) اگر زیریں عدالت (خواہ وہ ہائی کورٹ ہی کیوں نہ ہو) میں بلاوجہ مقدمہ تعویق کا شکار ہو رہا ہو (جیسا کہ جہاد ٹرسٹ کا یہ مقدمہ تھا جسے تین سال سے بلاوجہ لٹکایا ہوا تھا اور سماعت ہی نہیں ہو پا رہی تھی) تو براہ راست سپریم کورٹ سے رجوع کیا جا سکتا ہے بشرطے کہ معاملہ بنیادی حقوق کا ہو۔

۶۔ دستور اور قانون کی تعبیر عدلیہ اور صرف عدلیہ کا حق ہے۔ پاکستان کے دستور کی رو سے عدلیہ دستور کی محافظ ہے اور کوئی ایسی قانون سازی جو دستور کے خلاف ہو--- جس کی بنیاد اسلام اور قرارداد مقاصد ہے--- اسے کالعدم کرنے کا دستوری اختیار اعلیٰ عدالتوں کو حاصل ہے۔ گویا عدالتی نظرثانی judicial review پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کا دستوری حق اور ذمہ داری ہے اور بعد کے فیصلوں کی روشنی میں ہر ایسی دستوری ترمیم بھی خلاف قانون و دستور ہو گی جو دستور کی بنیادوں سے متصادم ہو۔

۷۔ دستور ایک وحدت (organic whole) ہے اور اس کا ایک حصہ دوسرے کی تعبیر کرتا ہے۔ اور

اگر اس کے مختلف حصوں کے درمیان بظاہر تنازع اور تناقض ہو تو اس کی ایسی تعبیر کی جائے گی جو باقی حصوں سے ہم آہنگ اور دستور کی بنیادوں کے مطابق یا ان سے قریب تر ہو۔

ان سات بنیادی اصولوں کو طے کرنے کے ساتھ ساتھ اس فیصلے میں ججوں کے تقرر اور عدلیہ کی آزادی کے بارے میں بھی چند بنیادی اصول اور ضابطے طے کر دیے گئے ہیں تاکہ تمام ابہام دور ہو جائیں اور عدلیہ اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک انجام دے سکے۔ ان میں اہم ترین یہ چھ اصول اور ضابطے ہیں:

(الف) ججوں کا تقرر میرٹ کی بنیاد پر اور صاف و شفاف طریقے سے ہونا چاہیے۔ یہ عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کا ایک لازمی حصہ ہے۔

(ب) دستور ججوں کے تقرر کے لیے مشورہ (consultation) اور اس کا ایک واضح نظام تجویز کرتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض حکومت کا اختیار نہیں اور اس میں کسی کو بالادستی حاصل نہیں۔

(i) یہ مشورہ محض رسمی نہیں بلکہ لازمی (mandatory) ہے۔

(ii) مشورے میں صدر، چیف جسٹس اور متعلقہ صوبے کا گورنر اور ہائی کورٹس کے لیے متعلقہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس شریک ہوں گے۔

(iii) مشورہ بامعنی، بامقصد، فیصلہ کن اور اتفاق رائے پیدا کرنے والا ہونا چاہیے تاکہ اس امر کی کوئی گنجایش نہ رہے کہ تقرر میں کسی قسم کی بے قاعدگی، سیاسی مصلحت، اثر و رسوخ اور من مانی کارروائی کا دخل ہو۔

(iv) ماضی کی محض سیاسی وابستگی کوئی لازمی نااہلیت (disqualification) نہیں لیکن سیاسی مقاصد کے لیے یا سیاسی رشوت کے طور پر تقرری کی کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

(v) انتظامی سربراہ (گورنر) ایک فرد کے عام کردار اور پس منظر کے بارے میں صحیح مشورہ دے سکتا ہے مگر اس کی قانونی قابلیت اور صلاحیت کا تعین صرف قانونی مہارت اور تجربہ رکھنے والے افراد ہی کر سکتے ہیں، اس لیے ان معاملات میں چیف جسٹس ہائی کورٹ اور چیف جسٹس آف پاکستان کی رائے حتمی حیثیت رکھتی ہے۔

(vi) تقرر کا آخری اختیار صدر کو حاصل ہے لیکن صدر نہ چیف جسٹس کے مشورے کے خلاف کوئی نام تجویز کر سکتا ہے اور نہ مشورے کے بغیر۔ اگر چیف جسٹس کے مشورے سے اسے اختلاف ہو تو تحریری طور پر وجوہ کا اظہار ضروری ہے اور قانونی قابلیت اور اہلیت کی حد تک چیف جسٹس ان وجوہ / وجوہ انکار پر بات کرنے کا حق رکھتا ہے۔

(vii) تقرری کے لیے چیف جسٹس اور صدر دونوں کا اتفاق ضروری ہے۔ چیف جسٹس کے انکار پر

کسی شخص کو عدالت پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

(viii) تقرر کے بعد ترقی سینیاریٹی کی بنیاد پر ہو گی اور یہی صورت ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے لیے بھی ہونی چاہیے تاکہ سب سے سینیر جج اس مقام پر آسکے۔

(ix) جو جج بطور ایڈیشنل جج کام کر رہے ہوں ان کا مستقل تقرری کے وقت پہلا حق بنتا ہے الا یہ کہ ان کے خلاف کوئی بات ہو۔

(x) جج بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دس سال سے عملاً پریکٹس کر رہا ہو۔ محض رجسٹریشن کافی نہیں ہے۔

(ج) چیف جسٹس کے عہدے پر قائم مقام تقرری صرف عارضی ہو سکتی ہے۔ عام حالات میں ۳۰ دن اور غیر معمولی حالات (مثلاً موت) میں زیادہ سے زیادہ ۹۰ دن۔ قائم مقام چیف جسٹس روز مرہ کے امور کو چلانے کی ذمہ داری ادا کرے گا مگر ججوں کے تقرر میں اس کا مشورہ موثر نہیں ہو گا۔ یہ مشورہ مستقل چیف جسٹس ہی کا ہونا چاہیے۔

(د) ججوں کی خالی آسامیوں کو بھی ایک مہینے کے اندر پر کر دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح خالی ہونے والی آسامیوں کے معاملات کو پہلے سے زیر غور لانا چاہیے تاکہ جگہ خالی ہونے کے ۳۰ دن کے اندر اندر نئی تقرری ہو جائے۔

ضمنی طور پر اس فیصلے نے یہ اصول بھی طے کر دیا ہے کہ دستور میں ۳۰ دن اور زیادہ سے زیادہ ۹۰ دن سے زیادہ کسی بھی عہدے کے خالی رہنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس طرح دستور پر عمل کے لیے ایک میزان وقت طے کر دی گئی ہے جس کا اطلاق تمام تقرریوں اور متعلقہ امور پر ہو گا۔

(ہ) سپریم کورٹ کے ججوں کو ہائی کورٹ میں قائم مقام چیف جسٹس کے طور پر لگانا یا سپریم کورٹ کے ججوں یا ہائی کورٹس کے چیف جسٹس صاحبان کو ان کی مرضی کے بغیر شریعت کورٹ میں بھیجنا دستور کے خلاف اور عدالت کی آزادی کے منافی ہے۔ اس طرح بطور سزا کسی جج کو اس کی مرضی کے خلاف منتقل کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ دستور کے آرٹیکل ۲۰۹، اور اس سلسلے کی دوسری شقوں پر اس کے غلبے کی بڑی واضح تعبیر اس فیصلے میں کر دی گئی ہے۔

(و) مستقل ججوں کی نشستوں کے خالی ہونے کی صورت میں ایڈہاک ججوں کا تقرر درست نہیں۔

سات بنیادی اصولوں کے علاوہ ججوں کے تقرر اور منتقلی کے بارے میں یہ چھ اصول اور ضابطے ہیں جو اس فیصلے میں طے کیے گئے ہیں۔ اس طرح پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عدلیہ نے دستور کے مطابق اپنی حصار بندی اس طرح کی کہ وہ ایک آزاد اور بااختیار ادارے کے طور پر کام کر سکے۔ اور یہ حصار بندی

(fortification)، بنیادی حقوق کے تحفظ، قانون کی بالادستی اور انصاف کے حصول کے لیے شرط لازم ہے۔ البتہ ہماری نگاہ میں یہ تمام چیزیں اس مقصد کے لیے ضروری (necessary) تو ہیں لیکن کافی (sufficient) نہیں۔ بدقسمتی سے ان کے ضروری ہونے کو بھی سیاسی قیادتیں قبول کرنے کو تیار نہیں جو جمہوریت اور قانون کی بالادستی کے لیے کوئی نیک فال نہیں۔

عدلیہ نے قانون کی بالادستی اور انصاف کے قیام کے لیے جو حصار بندی کی ہے اسے بڑے غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور اسے پارلیمنٹ کی بالادستی پر ضرب قرار دیا جا رہا ہے جو محض ایک خلط مبحث ہے۔ ہم اس پر آیندہ گفتگو کریں گے لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بڑی پارٹیوں اور ان کے وزرائے اعظم کے رویے کو بھی پوری دیانت اور معروضی انداز میں سامنے رکھا جائے تاکہ مرض کی صحیح تشخیص ہو سکے۔

محترمہ بے نظیر صاحبہ نے ۲۰ مارچ کے فیصلے کو اپنے اور پارلیمنٹ کے خلاف عدلیہ کی طرف سے اعلان جنگ سمجھا اور آخری وقت تک اس فیصلے پر عمل درآمد کو روکنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ صدر نے جو چارج شیٹ ان کی حکومت کو برطرف کرنے کے جواز میں مرتب کی اس میں ان کے اس رویے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور اسے سپریم کورٹ کی اکثریت نے اس حکومت کا ایک ایسا جرم تسلیم کیا ہے جس پر حکومت کو بجا طور پر برطرف کیا گیا۔

موجودہ وزیراعظم صاحب اور ان کے حواریوں نے بھی عملاً جو رویہ اختیار کیا وہ محض پانچ ججوں کے تقرر میں تاخیر نہیں بلکہ دراصل ۲۰ مارچ کے فیصلے کے مطابق چیف جسٹس کی سفارش نہ مان کر دراصل اس فیصلے اور عملاً اس میں طے شدہ تمام ہی بنیادی اصولوں سے اپنے اختلاف اور ان پر عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ چیف جسٹس اور عدلت نے جس استقامت کا ثبوت دیا ہے وہ محض رائے پر اصرار نہیں بلکہ ان اصولوں کو منوانے کی جدوجہد ہے--- اور یہ جدوجہد جاری ہے کہ ابھی تک اقتدار وقت نے انھیں کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا۔

آیئے، پہلے دیکھ لیں کہ ان دونوں پارٹیوں کا موقف کیا رہا ہے؟

بے نظیر حکومت کا رویہ، صدر کی چارج شیٹ اور خود عدالت کے فیصلے کا حصہ ہے۔ ان کے موقف کو ذہنوں میں تازہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ کے فیصلے سے حوالہ دیا جا رہا ہے۔

قومی اسمبلی میں وزیراعظم صاحبہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۹۶ کو بیان دیا جس میں فیصلے پر تنقید کی، اس میں عدالت کو سیاسی دراندازی کا مرتکب قرار دیا گیا اور یہاں تک کہا گیا کہ عدالت میری حکومت کا حصہ ہے۔ ۲۹ مارچ کو

فرمایا کہ "سپریم کورٹ ایک منی آئین (mini constitution) کا اضافہ کرنے کا کام نہیں کر سکتی" یہاں تک فرما گئیں کہ "فیصلہ مانا تو چیف جسٹس کو جانا پڑے گا"۔ جرمن ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "حکومت سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہے اور وہ ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں"۔

موجودہ وزیراعظم صاحب نے جو اس وقت قائد حزب اختلاف تھے، بے نظیر صاحبہ اور ان کی حکومت کے اس موقف کو اس وقت دستور سے غداری قرار دیا تھا اور عدالت کو خراج تحسین پیش کیا تھا لیکن اب ان کا کیا موقف ہے؟ وہ اور ان کے تمام ساتھی عدالت کے تعبیر دستور کے حق کو چیلنج کر رہے ہیں اور اسے قانون سازی اور پارلیمنٹ کی بالادستی پر حملہ قرار دے رہے ہیں اور ججوں کی تقرری کو انتظامیہ کا اختیار قرار دے رہے ہیں۔ سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد تک کم کرنے کا آرڈیننس لے آئے اور پھر اسے واپس لینا پڑا۔ ججوں کی تقرری کو آخری وقت تک التوا میں ڈالا اور جب چیف جسٹس نے دستور کے آرٹیکل ۱۹۰ کے تحت صدر کو اقدام کا مشورہ دیا اور صدر اور چیف آف اسٹاف نے حکومت کے غیر آئینی رویے کی تائید و توثیق سے انکار کر دیا تو "قومی مفاد" میں چیف جسٹس کے مشورے کے مطابق تقرریاں کر دیں۔ لیکن کس ذہنی تحفظ کے ساتھ؟ وزیراعظم صاحب کی تقریر کا یہ حصہ قابل غور ہے:

"پارلیمنٹ پارلیمانی نظام جمہوریت کا سب سے بنیادی اور بالادست ادارہ ہے، قوم کے وقار کی علامت ہے، پارلیمنٹ دستور کی خالق بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ دوسرے تمام ادارے موجود ہوں، لیکن پارلیمنٹ نہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا، آمریت نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ پارلیمنٹ ہمارے جسد جمہوریت میں دل کا مقام رکھتی ہے، باقی ادارے اس کے معاون کا کردار ادا کرتے اور دستور کی حاکمیت کی ضمانت دیتے ہیں۔ جمہوریت کے استحکام اور بقا کے لیے لازم ہے کہ ہر ادارہ اپنے دائرے میں کام کرے، کسی دوسرے ادارے کے فرائض خود نہ سنبھال لے"۔

وزیراعظم صاحب یہ دعویٰ کرتے وقت بھول گئے کہ جرمنی اور اٹلی میں فسطائی نظام کے تحت اور ساری اشتراکی دنیا میں اشتراکی آمریت کے دور میں پارلیمنٹ موجود تھی مگر کسی نے اس نظام کو جمہوری تسلیم نہیں کیا!

دونوں پارٹیوں اور ان کے سربراہوں کے خیالات کا تجزیہ کیا جائے تو بنیادی بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ:

(۱) عدلیہ کو حکومت کا حصہ اور اس کے ماتحت سمجھتے ہیں۔

(۲) عدلیہ کے دستور اور قانون کی آخری تعبیر کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اس اختیار

کے تحت عدلیہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو کالعدم (void) قرار دے سکتی ہے۔ وہ اس اختیار کو پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیار پر حملہ تصور کرتے ہیں۔

یہ دونوں مفروضے غلط اور اسلام اور جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں اور جب تک سیاسی قیادت ان غلط مفروضوں سے برات کا اعلان نہیں کرتی' نہ یہ کش مکش ختم ہوگی اور نہ جمہوریت کی بنیادیں مستحکم ہو سکیں گی۔

عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری اور حکومت وقت سے اس کا جداگانہ وجود اسلام اور جمہوریت کا ایک بنیادی اصول ہے۔ یہ عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ دستور اور قانون کا مکمل احترام ہو رہا ہو اور جہاں بھی اس سے انحراف ہو اور لوگوں کو اصحاب اقتدار یا دوسرے لوگ ان کے حقوق سے محروم کر رہے ہوں وہ ان پر گرفت کرے اور حق دار کو حق دلوائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب حکومت بھی اسی طرح عدالت کے سامنے جواب دہ ہو جس طرح باقی تمام افراد۔ عدالت ہی تو وہ جگہ ہے جہاں خود حکومت کے خلاف دادرسی کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور جس کے سامنے حاکم اور محکوم برابر ہیں۔ یہ صرف آمرانہ اور فسطائی نظام ہی میں ہو سکتا ہے کہ عدلیہ حکومت کا حصہ اور اس کے ماتحت ہو۔ اسلام اور جمہوریت دونوں میں اس کی کوئی گنجایش نہیں۔ اسلام کے موقف کو سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ سے صرف دو واقعات پیش ہیں۔

خلافت راشدہ میں حضرت علیؓ کا دور خلافت ہے۔ دارالخلافہ کوفہ منتقل ہو گیا ہے اور قاضی شریح چیف جسٹس ہیں۔ امیرالمومنین حضرت علیؓ اور ایک یہودی کا تنازعہ ان کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ امیر المومنین کی زرہ کہیں گر پڑی تھی جو اس یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔ حضرت علیؓ کو پتا چلا تو اس سے زرہ کا مطالبہ کیا مگر یہودی نے زرہ دینے سے انکار کر دیا۔ امیرالمومنین نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چیف جسٹس نے فریقین کے بیان لیے۔ یہودی نے کہا کہ زرہ میری ہے اور ثبوت یہ ہے کہ میرے قبضے میں ہے۔ یہ مدعی کی ذمہ داری ہے کہ ثبوت لائے اور شہادت پیش کرے۔ قاضی شریح نے امیرالمومنین سے اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کرنے کو کہا۔ دو گواہ پیش ہوئے: حضرت حسنؓ اور حضرت قنبرؓ۔ قاضی شریح نے حضرت قنبرؓ کی شہادت قبول کر لی لیکن کہا کہ حسنؓ کی شہادت قابل قبول نہیں۔ حضرت علیؓ نے متعجب ہو کر کہا: آپ حسنؓ کی شہادت مسترد کرتے ہیں جب کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔ قاضی شریح نے کہا: ہاں آپؓ سچ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یہی فرمایا لیکن یہ بھی اسلام کا اصول ہے کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر نہیں۔ دوسرا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے امیرالمومنینؓ کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔

اس واقعے پر غور کرنے سے تین بڑی بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) عدالت اور حکومت کا ایک دوسرے سے آزاد اور خود مختار وجود۔

(۲) قانون کی حکمرانی۔ حضرت علیؓ امیرالمومنین ہوتے ہوئے بھی اپنی زرہ واپس نہیں لے لیتے اور نہ انتظامیہ کے کسی کارپرداز کو اسے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اقتدار کی قوت کے مقابلے میں عدالت کی قوت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس طرح عدالت کی آزادی اور قیام انصاف اور نفاذ قانون کے باب میں اس کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں۔

(۳) عدالت بے لاگ انصاف کرتی ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کو برابر سمجھتی ہے۔ قانون کے مطابق شہادت طلب کرتی ہے اور ناکافی شہادت ہونے پر حکومت وقت کے دعوے کو خارج کر دیتی ہے۔ وہ حضرت حسنؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی گواہی قبول نہیں کرتی کہ یہ اس معاملے میں انصاف کے اصول کے خلاف ہے اور فیصلہ امیرالمومنین کے خلاف جاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا اصول انصاف۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہودی گو مقدمہ جیت گیا لیکن نقد دل ہار گیا۔ بے لاگ انصاف کی اس مثال کو دیکھ کر اعلان کرتا ہے کہ زرہ حضرت علیؓ کی ہے اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ اور بھی آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ یہ خلافت راشدہ کے بعد کا دور ہے، دوسری صدی ہجری کا وسط۔ مسلمانوں کی حکومت تینوں براعظموں تک قائم ہو گئی ہے۔ وسطی ایشیا کا مسلمان فاتح کمانڈر قتیبہ بن مسلم سمرقند میں فاتحانہ داخل ہوتا ہے اور بہترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ البتہ فاتحانہ داخلے کے موقع پر بعض ایسی شرائط کی پاسداری کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے جو محض رسمی نوعیت کی سمجھی گئی تھیں۔ بعض مقامی باشندے قاضی عسکر کے روبرو عرض داشت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ دوران فتح فلاں فلاں شرائط کی پاسداری نہیں کی گئی اس لیے یہ ساری کارروائی کالعدم کی جائے اور فوج کو حکم دیا جائے کہ وہ شہر خالی کر دے۔ چنانچہ سمرقند شہر کے بدھ باشندوں نے قاضی عسکر کے روبرو فاتح کمانڈر قتیبہ بن مسلم کے خلاف عرض داشت دائر کی، قاضی نے اپنے ہی سپہ سالار کے خلاف غیر مسلموں کی شکایات سنیں، سپہ سالار اسلام کا موقف سنا اور حکم دیا کہ شہر خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ جو شہر قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا تھا، وہ اس نے اپنے ہی قاضی کے حکم پر بلاچون و چرا خالی کر دیا اور اہل شہر میں منادی کرا دی گئی کہ اگر اس پورے عمل کے دوران کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ اسلامی شریعت کے مطابق تاوان طلب کر سکتا ہے (بحوالہ مورخ بلاذری، فتوح البلدان، باب فتح سمرقند---- ملاحظہ ہو خطبات بہاولپور، (۲) اسلام کا قانون بین الممالک۔ محمود احمد غازی، ص ۵۹-۶۰)

رہا جمہوریت کا اصول تو مشہور ماہر قانون پروفیسر البرٹ ڈائی سی (Prof. Albert V. Dicey) سے لے

کر سر آئی ور جیننگ (Sir Ivor Jenning) تک سب اس بات پر متفق ہیں کہ عدلیہ کی آزادی، جمہوری نظام کے لیے ضروری ہے۔ عدلیہ مستقل بالذات اور خود مختار ادارہ ہے جو اپنے دائرے میں بالادست ہے۔ پارلیمنٹ کا کام قانون بنانا اور عدلیہ کا کام قانون نافذ کرنا اور اس کی تعبیر کرنا ہے۔ یہ صورت برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی ہے جب کہ امریکہ کے دستور اور اس کی تاریخی تعبیرات کی روشنی میں امریکہ اور ان تمام ممالک میں جہاں تحریری دستور نافذ ہیں، عدلیہ کا کام صرف تنفیذ اور تعبیر قانون ہی نہیں بلکہ جوڈیشیل ریویو (Judicial Review) کے اصول کے تحت قانون یا حکومتی حکم کے، دستور کے مطابق یا اس سے متصادم ہونے کا فیصلہ کرنے کا اختیار بھی اسے حاصل ہے۔ امریکہ میں چیف جسٹس مارشل نے ۱۸۰۳ میں Marbury vs Modison کے مقدمے میں اس اصول کو طے کیا تھا جسے وقت کی منصف حکومتوں کے تحفظات کے باوجود بالآخر دستوری قانون کا ایک مسلمہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جب صدر روز ولٹ نے اپنے مشہور زمانہ نیو ڈیل (new deal) کے چند قوانین کو سپریم کورٹ کی طرف سے خلاف دستور قرار دینے پر انتقامی کارروائی کی کوشش کی اور اس کے لیے سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد کو بڑھا کر اپنی پسند کے جج لگانے کا منصوبہ بنایا تو کانگریس نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دستور کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور اس کے جوڈیشیل ریویو کے حق کو اجتماعی تائید حاصل ہوئی۔

برطانیہ کے پارلیمانی نظام کے بارے میں لیونارڈ جے سن لوائیڈ (Leonard Jason Lloyed) اپنی کتاب The Constitution (مطبوعہ لندن، فرینک کاس ۱۹۹۶، ص ۴۲-۴۳) میں لکھتا ہے:

"گو ہمارے دستوری نظام میں پارلیمنٹ سب سے بالاتر قانون ساز ادارہ ہے، یہ اختیار عدالتوں کو حاصل ہیں، جو ججوں پر مشتمل ہوتی ہیں کہ ان قوانین کو نافذ کرائیں اور ان کے جواز کا فیصلہ کریں۔ یہ ممکن نہیں کہ پارلیمنٹ کے قوانین ہر انسانی خطا کے بارے میں مداوا فراہم کریں یا ہر غیر قانونی حرکت کا احاطہ کر لیں، اس لیے یہ وظیفہ عدالتوں کا ہے کہ وہ قانون کی تعبیر کریں اور جہاں کوئی واضح حکم موجود نہیں، یا جہاں مفہوم مبہم اور غیر واضح ہو، وہاں خود قانون کا تعین کریں۔ پس جج حضرات خود بھی قانون سازی کا ایک وظیفہ انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کامن لا (common law) وجود میں آیا جو ججوں کے بنائے ہوئے قانون سے عبارت ہے، ان تمام امور کے سلسلے میں جو پارلیمنٹ کے ایکٹ میں موجود نہیں۔ نیز ایک بہت اہم ذریعہ جس سے عدالت حکومت پر (اور ایک حد تک خود قانون سازی پر) اپنی گرفت رکھتی ہے اور اسے حدود کا پابند بناتی ہے وہ عدالتی نظرثانی ہے جو خود اب ہمارے ملک (یعنی انگلستان) میں قانون کا سب سے تیزی سے ترقی کرنے والا میدان ہے"۔

لارڈ ڈپلاک (Lord Diplock) نے عدالتی نظرثانی کی تین بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے یعنی--- کسی

قانون کے بارے میں یہ طے کرنا کہ اس میں لاقانونیت (illegality) کا کوئی عنصر ہے، یا وہ غیر عقلی (irrationality) ہے یا صحیح طریقے سے وجود میں نہیں آیا (procedural impropriety)۔

ہم نے برطانیہ کے قانونی نظام سے یہ مثال صرف اس لیے دی ہے کہ ہمارے حکمران بار بار پارلیمانی جمہوریت کی بات کرتے ہیں ورنہ امریکہ اور دوسرے تحریری دستور رکھنے والے ممالک، بشمول بھارت کے بارے میں تو یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عدالت کا ادارہ نہ صرف یہ کہ ایک مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ادارہ ہے بلکہ اسے جوڈیشل ریویو کا اختیار حاصل ہے اور اس جوڈیشل ریویو کا دائرہ صرف قانون تک محدود نہیں بلکہ مختلف ممالک میں وہ دستوری ترامیم تک جو دستور کے بنیادی ڈھانچے سے ہم آہنگ نہ ہوں اس کی زد میں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال خود بھارت کی ہے جہاں سپریم کورٹ نے ۱۹۷۳ کے مشہور مقدمے (Kesavananda Vs. Kerala) میں جسے عرف عام میں بنیادی حقوق کا مقدمہ کہا جاتا ہے (AIR 1973 SC 1461) یہ اصول طے کیا کہ دستور کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم کوئی دستوری ترمیم بھی کرنے کا اختیار پارلیمنٹ کو نہیں، اس لیے کہ پارلیمنٹ دستور ساز ادارہ نہیں بلکہ دستور ساز ادارے کے بنائے ہوئے دستور میں صرف ترمیم کا اختیار رکھتی ہے۔ اس لیے کوئی ترمیم جو دستور کا حلیہ بگاڑ دے ترمیم نہیں، نئی دستور سازی ہے جس کا اسے اختیار نہیں (ہمارے وزیر اعظم صاحب کی تقریر میں جس طرح پارلیمنٹ کو "دستور کا خالق" قرار دیا گیا ہے وہ اس حقیقت کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے)۔ اس کی مزید وضاحت اندرا گاندھی بنام راج نرائن کے مقدمے کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے کی (AIR 1973 SC 2294) اور صاف الفاظ میں کہا کہ دستور بنانے والوں کا مقصد یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ دستوری ترمیم کے ذریعے وزیراعظم کو "ایک مشرقی آمر مطلق" (an oriental despot) بنا دیا جائے۔ پارلیمنٹ کا ترمیم دستور کا اختیار (آرٹیکل ۳۶۸) اپنی ظاہری لسانی وسعت کے باوجود صرف محدود اختیار دیتا ہے، مطلق نہیں۔ جب اندرا گاندھی نے اس فیصلے کا توڑ کرنے کے لیے دستور میں ترمیم کے آرٹیکل ۳۶۸ میں دو ترامیم (دفعہ ۴ اور ۵) کا اضافہ کیا اور عدالت کے اس اختیار کو ختم کر دیا کہ وہ کسی دستوری ترمیم کو خلاف دستور قرار دے تو سپریم کورٹ نے ۱۹۸۰ میں مائی نرواکل کیس (AIR 1980 SC 1989) میں اس ترمیم (یعنی ۴۲ ویں ترمیم) کو منسوخ کر دیا اور اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ پارلیمنٹ کے اس دعوے کو کالعدم کر دیا کہ اس کو ترمیم دستور کا غیر محدود اختیار ہے بلکہ اس کے اس حق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ دستوری ترمیم کے ذریعے عدالت کے اختیار کو محدود کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے جمہوری پارلیمانی نظام میں عدالت کی حیثیت۔

اسلام اور جمہوریت میں عدالت کے مقام اور اختیار کی اس بحث کی روشنی میں ذرا جناب وزیراعظم صاحب کی تقریر کا تجزیہ کیجیے جس میں ہر پارلیمنٹ کو "دستور ساز" قرار دیا جا رہا ہے، سب پر "بالادست"

کہا جا رہا ہے' اور باقی تمام اداروں کو "اس کے معاون کا کردار ادا کرنے" کا حکم دیا جا رہا ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر ان کے رفیق خاص اور وزیر قانون جناب خالد انور صاحب کے ایک مقالے سے ایک اقتباس پیش کر دیا جائے جو موصوف نے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ایک سیمینار میں وزارت سے قبل پیش کیا تھا جو زیر طبع کتاب: Pakistan: Secular or Islamic میں شائع ہو رہا ہے:

"عدالت کا یہ اختیار لادینی اور مذہبی دونوں ہی دستوری نظاموں میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد پارلیمنٹ کو اپنی دستوری حدود سے آگے بڑھنے سے روکنا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی اختیار نہیں ہے (اور مختلف ممالک میں اس پر عمل ہو رہا ہے) اسے پارلیمنٹ کے اختیارات کو غصب کرنا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دراصل اس کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ پارلیمنٹ کو ان اختیارات کو غیر قانونی طور پر اپنے قبضہ قدرت میں لانے سے روکا جائے جو اسے حاصل نہیں"۔ (ترجمہ)

آج وزیر قانون صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے اور ان کے اس سابقہ موقف کو دیکھا جائے تو بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

وہی کارواں' وہی منزلیں' وہی قافلہ' وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر' کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

اس وقت ایک مغالطہ یہ بھی دیا جا رہا ہے کہ گویا حالیہ کش مکش پارلیمنٹ اور عدلیہ کے درمیان ہے اور عدلیہ پارلیمنٹ کے اختیارات پر شب خون مارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم نے اوپر جو مثالیں انگلستان' امریکہ اور بھارت کے آئین اور سیاسی نظاموں سے دی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایک جمہوری نظام میں اصل بالادستی دستور کو حاصل ہے اور پارلیمنٹ' حکومت اور عدلیہ تینوں ہی دستور کی مخلوق (creatures of the constitution) ہیں اور سب ہی مساوی طور پر دستور کے تابع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں بااختیار ہے لیکن کوئی بھی کسی دوسرے پر بالاتر نہیں ہے۔ پارلیمنٹ اور عدلیہ کی کش مکش کی بات محض ایک افسانہ اور خلط مبحث ہے۔ البتہ اصل تنازعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر حکومت دونوں دوسرے اداروں یعنی پارلیمنٹ اور عدلیہ پر اپنی بالادستی قائم کرنا اور ان کو اپنا تابع مہمل بنانا چاہتی ہے اور یہی اصل مسئلہ بھی ہے جو جمہوریت کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

تاریخی اعتبار سے بھی اگر آپ دیکھیں، تو پائیں گے کہ برطانیہ میں چار سو سال تک پارلیمنٹ کی بالادستی کی جو کش مکش ہوئی ہے اس کا کوئی تعلق عدلیہ سے نہیں تھا بلکہ اصل کش مکش بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان تھی۔ Glorious Revolution میں صرف نظری طور پر پارلیمنٹ کی حکومت پر بالادستی تسلیم کی گئی۔ حکومت یا انتظامیہ نام تھا بادشاہ اور اس کی کیبنٹ کا جو پارلیمنٹ سے برسرجنگ رہے۔ عملاً پارلیمنٹ کی یہ بالادستی ۱۹۱۱ کے قانون کے ذریعے قائم ہوئی لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے بعد سے آہستہ آہستہ صورت یہ بن گئی ہے کہ اب عملاً انگلستان کے پارلیمانی نظام میں پارلیمنٹ وزیراعظم کی مٹھی میں چلی گئی ہے اور پارٹی سسٹم کی وجہ سے جو جواب وہی حکومت کی پارلیمنٹ کے سامنے ہونی چاہیے وہ نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت خود انگلستان میں، جہاں اب بھی حکومت پر گرفت اور اس کے موثر احتساب کے ہزاروں راستے ہیں جن میں آزاد پریس، آزاد عدلیہ، موثر حزب اختلاف، سیاست سے پاک بیوروکریسی اور سیکڑوں دستوری روایات ہیں، اس وقت جو علمی مباحث ہو رہے ہیں، ان کا تعلق ایک بار پھر وزیراعظم اور حکومت کے مقابلے میں پارلیمنٹ کی بالادستی کی بحالی سے ہے۔

ٹی بین (T. Benn) اپنی کتاب Argument for Democracy (مطبوعہ لندن، ۱۹۸۱، ص ۱۸-۱۹) میں "دستوری وزارت عظمیٰ" کا تصور پیش کرتا ہے اور رقم طراز ہے:

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ برطانیہ کا وزیراعظم اس وقت جن اختیارات کا مالک ہے، ان کا دائرہ، وزیراعظم اور پارٹی لیڈر دونوں حیثیتوں سے اتنا بڑھ گیا ہے کہ یہ ووٹروں کے جائز قانونی حقوق پر اثرانداز ہوتا ہے، پارلیمنٹ کے ضروری کردار کو نقصان پہنچاتا ہے اور کابینہ کے اجتماعی فیصلے کرنے کے بعض اختیارات کو سلب کر لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک فرد کے ہاتھ میں اختیارات کا موجودہ ارتکاز بہت زیادہ ہو گیا ہے اور عملاً اس نے ہماری پارلیمانی جمہوریت کے قلب میں شخصی حکومت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وزیراعظم اور پارٹی لیڈر کو ان افراد کے سامنے زیادہ جواب دہ ہونا چاہیے جن پر وہ اپنے اختیارات استعمال کرتا یا کرتی ہے تاکہ ہم برطانیہ میں دستوری وزارت عظمیٰ قائم کر سکیں۔ مطلق وزارت عظمیٰ کو دستوری وزارت عظمیٰ میں تبدیل کرنے کے لیے اس کے وظائف میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کرنا ہوں گی جو اس نوعیت کی ہوں گی جو تاج برطانیہ کو مطلق بادشاہت سے دستوری بادشاہت میں تبدیل کرنے کے لیے کئی برسوں کے دوران کی گئی تھیں۔ تبدیلی کے حق میں دلائل موجودہ نظام کے تجربے سے فراہم ہوتے ہیں جس میں وزیراعظم کو اپنی مرضی کے مطابق چلنے کی طاقت حاصل ہے"۔

ایک اور حالیہ کتاب، British Politics: Constitutional Changes (مطبوعہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، آکسفورڈ، ۱۹۹۰) میں پروفیسر ڈی کیواناج (D. Kavanagh) اسی موضوع سے بحث کرتا ہے اور

خصوصیت سے مارگریٹ تھیچر کی وزارت عظمیٰ کے بارے میں کہتا ہے: اب انگلستان میں جو طرز حکومت رائج ہے اسے .Prime Ministerial Govt کہنا بجا ہو گا (ص ۲۰۸)۔ پارلیمانی جمہوریت کا جب یہ عالم انگلستان میں ہے تو قیاس کیجیے کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، جہاں عملاً پارلیمنٹ ایک عضو معطل ہے، اقتدار کا سارا ارتکاز وزیراعظم کے ہاتھوں میں ہے، کابینہ بھی اس کی مٹھی میں ہے، تمام اہم فیصلے کابینہ اور پارلیمنٹ کے باہر ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے لیے نمایندگی کے لیے ٹکٹوں کی تقسیم سے لے کر ریاستی امور پر فیصلوں تک اہم بین الاقوامی معاہدوں سے لے کر تمام بنیادی تقرریوں تک (جو کبھی تو تھانے دار اور میونسپل کونسلر تک کی سطح کو چھو لیتے ہیں) سب ہی اختیار وزیراعظم کے ہاتھ میں ہے۔ یہ "پارلیمانی جمہوری نظام" نہیں "وزیراعظمی نظام" ہے اور وہائی دی جا رہی ہے پارلیمنٹ کی بالادستی کی!

برعکس نہند نام زنگی کافور!

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اصل مسئلہ پارلیمنٹ اور عدلیہ کا نہیں، اصل مسئلہ حکومت بلکہ وزیراعظم اور عدلیہ کا اور وزیراعظم اور پارلیمنٹ کا ہے۔ اس پس منظر میں چودھویں دستوری ترمیم بڑی معنی خیز ہے۔ پارلیمنٹ کی بے بسی کا اندازہ تو اس کیفیت سے کیا جا سکتا ہے جس میں تیرھویں اور چودھویں دستوری ترامیم دونوں ایوانوں سے منظور کرائی گئی ہیں تو کوئی مشورہ ہوا، نہ کوئی قومی بحث ہوئی، نہ پارلیمنٹ میں بحث ہوئی بلکہ اس تجربے کی روشنی میں جو راقم کو ۱۲ سال تک سینیٹ میں ہوا، یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ارکان کی اکثریت نے ان ترامیم کے پورے متن کو ایک بار پڑھا بھی نہیں ہو گا۔ بس وزیراعظم کے حکم پر ارکان کو ڈھور ڈنگر کی طرح سارے ملک میں نہیں ساری دنیا میں وہ جہاں بھی تھے، وہاں سے اسلام آباد لے آیا گیا اور چند گھنٹوں میں قومی اسمبلی اور سینیٹ سے اتنی اہم دستوری ترامیم منظور کروا ڈالی گئیں۔ یہ ہے وہ طرز حکومت جو جمہوریت کے لیے اصل خطرہ، اور پارلیمنٹ کے اختیارات غصب کرنے کی بدترین مثال ہے۔

چودھویں ترمیم کے ذریعے وزیراعظم اور پارٹی لیڈر کی گرفت تمام "منتخب نمایندوں" پر اور بھی سخت کر دی گئی ہے۔ مفاد کی خاطر پارٹی بدلنا اور "لوٹا ازم" بلاشبہ اسلام، اخلاق، شرافت، غیرت، جمہوریت ہر ایک کے خلاف ہے اور جو حضرات آج اس کے خلاف گل افشانیاں کر رہے ہیں، وہی ماضی میں اور آج بھی اس مال کے سب سے بڑے تاجر رہے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ایک پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر مفاد کی خاطر پارٹی بدلنا ایک برائی اور جرم ہے اور اس پر پابندی ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن منتخب نمایندوں کی مکمل زبان بندی، پارلیمنٹ میں اظہار رائے کی آزادی سے ان کو محروم کر دینا اور محض پارٹی لیڈر کے پرچے پر ان کی رکنیت ختم کر دینا، اسلام اور جمہوریت دونوں کے اعتبار سے ایک ناروا اختیار ہے اور ضمیر کی آزادی اور

اشرف المخلوقات کے عزت نفس کے خلاف ہے۔ اسلام ہر فرد کو اپنے اولی الامر سے اختلاف کا حق دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو اصل معیار حق قرار دیتا ہے (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (النساء ۴:۵۹)) معروف میں اطاعت امیر کا حکم بلاشبہ اسلام دیتا ہے مگر شوریٰ کے نظام کے ساتھ۔ نیز معصیت میں کسی بڑے سے بڑے کی اطاعت سے بھی منع کرتا ہے (لا طاعة المخلوق فی معصیت الخالق)۔ اسلامی نظام میں شورائیت اور جمہوریت ہے۔ نیز ڈسپلن ایک بات ہے اور زباں بندی ایک بالکل دوسری شے ہے' خواہ پارٹی کے اندر ہو یا پارٹی کے باہر۔ چودھویں ترمیم کا مقصد منتخب ارکان پر فرد واحد کے استبداد کو قائم کرنا ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ پارٹی لیڈر ہی آخری اتھارٹی ہے۔ وہ سیدھا الیکشن کمشنر کو فارغ خطی لکھ کر بھیج سکتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے جو طریقہ سیاسی جماعتوں کے قانون میں تھا اس میں شکایت اسپیکر اسمبلی' چیرمین سینیٹ کو جاتی تھی' جو اسے الیکشن کمشنر کو بھیجتا تھا۔ جو طریقہ چودھویں ترمیم میں اختیار کیا گیا ہے وہ بڑا غلط' آزادی کش اور بھونڈا طریقہ ہے خواہ ترمیم کا اصل مقصد کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ اس پر جو عارضی گرفت سپریم کورٹ نے کی ہے اسے بہانہ بنا کر عدالت کی تحقیر اور تذلیل کی جا رہی ہے اور عدلت کو "لوٹا ازم" کا محافظ قرار دیا جا رہا ہے جو سیاسی غنڈہ گردی کی بدترین مثال ہے۔

جمہوری ممالک میں اس سلسلے میں جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ ڈسپلن اور آزادی کے درمیان کی چیز ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں صرف فرنٹ بنچ پر جس کی حیثیت کیبنٹ یا سیکنڈ کیبنٹ کی ہوتی ہے' اختلاف رائے کے اظہار پر ایک حد تک پابندی ہوتی ہے گو عملاً وزرا تک کے درمیان اختلاف بھی پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر سامنے آتا رہتا ہے۔ لیکن پارٹی کے باقی تمام ارکان جنھیں بیک بنچرز کہا جاتا ہے ان پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی اور وہ خود اپنی حکومت کے احتساب کا فرض انجام دیتے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ میں خود اپنے بیک بنچرز کے عدم اطمینان کی وجہ سے ۷۴-۱۹۷۰ کے درمیان چار سال میں پانچ بار اور ۱۹۷۴ میں صرف ایک سال میں ۱۴ مرتبہ نیز ۱۹۷۴ سے ۱۹۷۵ تک ۲۹ بار سرکاری قراردلو ناکام (defeat) ہوئی لیکن اسے پارٹی کا بدلنا (defection) نہیں سمجھا گیا۔ اہم مسائل پر پارٹی وہپ (یعنی پارٹی کے حق میں ووٹ کی پابندی) بھی اٹھا لیا جاتا ہے اور ضمیر کے مطابق ووٹ کی آزادی ہوتی ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کی روایت یہ ہے کہ انتخابات کے بعد ایک ممبر پارلیمنٹ کی تین حیثیتیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ایک اپنے حلقہ انتخاب کا نمایندہ جس میں وہ پوری آبادی کی نمایندگی کرتا ہے محض اپنی پارٹی کی نہیں' دوسرے پورے ملک کی سطح پر ملک کا منتخب نمایندہ اور تیسرے پارٹی کا ایم پی۔۔۔۔ ان تینوں حیثیتوں میں توازن قائم کیا جاتا ہے اور صرف پارٹی بدلنے کو defection سمجھا جاتا ہے' آرا کے اظہار اور پارٹی قیادت سے اختلاف حتیٰ کہ پارٹی وہپ کی خلاف ورزی بھی

defection شمار نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو The Changing Constitution ed by, Jowel and Olivu خصوصیت سے باب چہارم جدید برطانوی جمہوریت ---- نظریہ اور عمل از Anthony H. Buch اور باب پنجم---- ڈان اولیور (Dawn Oliver) پارلیمنٹ اور سیاسی جماعتیں۔

ہم ایک بار پھر اس بات کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کو اصل خطرہ اس آمرانہ اور شخصی طرز حکمرانی سے ہے جو پارلیمانی جمہوریت کے نام پر یہاں فروغ دیا جا رہا ہے اور جس کے نتیجے میں کابینہ اور پارلیمنٹ دونوں غیر موثر بن گئے ہیں۔ حکمرانوں کے ان لامحدود اختیارات پر اگر کوئی تھوڑی بہت قدغن ہے تو وہ عدلیہ کی طرف سے آئی ہے' اس لیے عدلیہ کو پابہ زنجیر کرنے اور اپنے زیر اثر رکھنے کی ہر دور میں کوششیں ہوتی رہی ہیں اور اس وقت بھی یہی لڑائی جاری ہے۔

جمہوریت کو اصل خطرہ اسی ذہنیت اور اسے گوارا کرنے والے سیاسی کلچر سے ہے۔ عدالت کی آزادی اور خود مختاری اور پارلیمنٹ کی حکومت پر بالادستی اور گرفت ہی کے ذریعے اس بگاڑ کو درست کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب سیاست کے پورے نظام اور انداز کو بدلا جائے' عوام میں اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا شعور بیدار کیا جائے' پریس اپنا کردار آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کرے' متوسط طبقے اور عوام سے نئی قیادت ابھرے' پارٹیوں کی تنظیم اصول اور پروگرام کی بنیاد پر ہو اور خود ان کے اندر بھی جمہوریت قائم کی جائے' احتساب اور جواب دہی کا نظام رائج ہو اور ملک میں بھی دستور اور قانون کی حکمرانی اور قانون کے سامنے سب کی برابری کا نظام عملاً قائم کیا جائے۔ آزاد صحافت اور عدالت کی آزادی اور خود مختاری اس نظام کا نہایت اہم حصہ ہیں۔ ملک میں تمام اداروں کی حفاظت اور استحکام کے بغیر جمہوری عمل پروان نہیں چڑھ سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں شخصیت پرستی نے یہ شکل اختیار کر لی ہے کہ جو اقتدار پر آگیا' اس کے بارے میں کہا جانے لگتا ہے کہ "وہ ناگزیر ہے" حالانکہ قدرت کے اس کارخانے میں کوئی بھی ناگزیر نہیں---- رہے نام اللہ کا! یادش بخیر' خوشامدیوں نے جب فرانس کے وزیراعظم کلے مین شو (Clemencheau) سے جس نے ملک کو جنگ عظیم میں فتح سے شاد کام کیا تھا کہا کہ آپ فرانس کے لیے ناگزیر (indispensable) ہیں تو اس نے ان کے منہ پر یہ کہہ کر طمانچہ مارا کہ سارے indispensable انسانوں سے قبرستان بھرا پڑا ہے۔

جو حضرات اس وقت عدالت کی آزادی پر تیشہ زنی کر رہے ہیں انھیں سمجھنا چاہیے کہ اداروں کو بنانا اور ان کی حفاظت کرنا بڑا محنت طلب اور صبر آزما کام ہے جب کہ ان کو بگاڑ دینا بڑا آسان ہے۔ جناب خالد انور کے اس مضمون سے ایک اقتباس خود ان کی اور سارے اراکین پارلیمنٹ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا

ہے۔ کاش کہ یہ کسی حد تک بھی نظر کشا ثابت ہو!

"اداروں کے بنانے میں کئی نسلیں نہیں تو کئی عشرے ضرور لگتے ہیں لیکن ان کو تباہ کرنے کا کام صرف چند گھنٹوں میں نہایت مستعدی اور سفاکی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ یہ بے حرمتی کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہی دنیاوی اقتدار کی کرسیوں پر متمکن نہیں رہیں گے۔ اس ملک کے عوام کے ساتھ یہ بڑا ظالمانہ اور خوفناک فراڈ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سیکولر حکمران، دستور کے دیے گئے تحفظات چھین رہے ہیں۔ میعاد (tenure) کے تحفظ کو، جو عدلیہ کی آزادی کی بنیاد ہے، مجروح کر دیا گیا ہے اور "نگہبانوں" (baneful eye) نے چاہا ہے کہ عدالت کے ذریعے اصلاح (judicial rectitude) کی نازک کونپل کو پنپنے سے روک دیا جائے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہی لوگ جو، جب حزب اختلاف میں تھے، آزاد اور خود مختار عدلیہ کے لیے سب سے بڑھ کر بول رہے تھے، آج ملک میں عدل کے قلعے پر سوچا سمجھا حملہ کر رہے ہیں۔ شاید جو سب سے زیادہ چیخ پکار کرتے ہیں، لازماً سب سے زیادہ مخلص نہیں ہوتے۔ انتظامیہ کے آمرانہ احکامات سے عدلیہ کی آزادی پر حملہ، ان افراد کے لیے جو ایک آزاد اور منصفانہ معاشرہ چاہتے ہیں، سب سے زیادہ پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ (ترجمہ)

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

جمہوریت کے مستقبل کا انحصار قوم کے عزم اور قیادت کے انداز حکمرانی کی صحیح رخ پر تبدیلی پر ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور سب سے اہم ہیں:

اول، اسلام کے بارے میں مکمل یکسوئی رکھنا اور ظاہرداری، منافقانہ روش اور تناقض سے اپنے رویے کو پاک کرنا ہے۔ کسی کو یہ بات پسند ہو یا ناپسند، یہ ایک نظری ہی نہیں تاریخی حقیقت ہے کہ ملک کے عوام اسلام کو چاہتے ہیں اور اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام یا طریقہ مسلمانوں میں کامیابی سے چلایا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عملی نقطہ نظر سے اسلام اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر جمہوریت قانون کی حکمرانی اور عوام کی مرضی اور خواہش کے مطابق نظام زندگی کو چلانے کا نام ہے تو صرف اسلام ہی کے ذریعے جمہوریت روبہ عمل آ سکتی ہے اور نفاذ اسلام اور جمہوریت کی ترویج دونوں ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اسلام اور سیکولرازم کی کش مکش، آمریت اور فسطائی نظاموں پر منتج ہوئی ہے اور کسی ملک میں بھی غیر اسلامی اور خالص سیکولر قوانین جمہور کی تائید سے نہیں بلکہ آمریت کی استبدادی قوت کے ذریعے نافذ ہوئے ہیں۔ مغرب کے اہل نظر میں پروفیسر ولفریڈ اسمتھ (Prof. Dr. Wilfred Smith) نے اس حقیقت کا بہت ہی صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اسلامائزیشن ہی دراصل جمہوری عمل کے ذریعے

رونما ہو سکتا ہے اور اسلامی نظام ہی جمہور کی مرضی اور امنگوں کی تکمیل سے ہم آہنگ ہے۔ ملاحظہ ہو Pakistan as an Islamic State- فلسفہ' تاریخ اور سوشیالوجی کے ایک اور استاد پروفیسر ڈاکٹر فلمر نارتھروپ (Dr. Filmer Northrop) اپنے ایک مقالے میں جو ۱۹۵۸ کے اسلامی کلچر پر کلوکیم میں پیش کیا گیا تھا اور اسی سال پرنسٹن یونی ورسٹی سے شائع ہوا' ترکی اور مغربی ممالک کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"مجھے یقین ہے کہ ایسے قوانین (یعنی سیکولر قوانین) کے اول اول کسی نہ کسی آمر کے ذریعے نافذ ہونے کی یہی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس لیے کہ یہ قوانین کسی عوامی تحریک کے ذریعے کتاب قانون کا حصہ نہیں بن سکتے کیونکہ عوام تو پرانی روایت سے وابستہ ہیں"۔ (ترجمہ)

اس لیے ضروری ہے کہ سیکولرازم اور اسلام کی کش مکش کو پوری یکسوئی کے ساتھ دفن کر دیا جائے اور جو بھی جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اور اس نظام کا فروغ چاہتا ہے' خواہ اس کا تعلق ملک کی آبادی سے ہو یا باہر کی قوتوں سے' اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جمہوریت پرستی ہی کا تقاضا ہے کہ اسلام کو متنازع نہ بنایا جائے اور اس کو قانونی' معاشی' تعلیمی' سماجی و ثقافتی غرض ہر میدان میں نافذ کرنے کی موثر کوشش کی جائے۔ یہی ہمارے دستور کا تقاضا ہے جس کا حلف ہم نے لیا ہے اور یہی ۲۰ مارچ کے عدالتی فیصلے کا منطقی مطالبہ ہے۔ جو افراد اسلام کے نظام کو اپنے ایمان اور اپنے دین کا تقاضا سمجھتے ہیں وہ تو حق بجانب ہیں ہی' لیکن جو کسی بھی وجہ سے اسلام اور اس کے نظام کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں' ان کا بھی فرض ہے کہ اگر وہ جمہوریت کے بارے میں مخلص ہیں اور ملک میں جمہوریت کے مستقبل کو روشن اور تابناک دیکھنا چاہتے ہیں تو جمہور کی رائے کے احترام میں اسلام کی تائید کریں اور اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں--- ورنہ یہ کش مکش جاری رہے گی اور ملک کو جمہوری اور دستوری استحکام حاصل نہیں ہو سکے گا۔

دوم' حکمران اور دوسری موثر سیاسی قوتوں کے رویے کی تبدیلی ہے۔ دستور اور قانون ایک چیز ہے' دونوں بے حد اہم' لیکن دستوریت (constitutionalism) اور احترام دستور و قانون' شے دگر است۔ بلاشبہ ہمارے یہاں دستور و قانون کی اصلاح بھی' جہاں ضروری ہو' مطلوب ہے' لیکن اس سے زیادہ ضروری' دستور اور قانون پر عمل کرنے' دستور کے مطابق معاملات کو طے کرنے اور اس کے مطابق عملی رویے کو ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ آمریت' فسطائیت اور ظلم کا آغاز بھی اسی مقام سے ہوتا ہے کہ اپنے کو دستور اور قانون سے بالا سمجھا جائے یا دستور اور قانون کو اپنی مرضی یا مفاد کے تابع کرنے اور اسے ان کا موید بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے جب تک رویے نہیں بدلتے اور طرز حکمرانی اور فیصلے کرنے کا انداز تبدیل نہیں ہوتا' دستور اور قانون کی حکمرانی ایک خواب ہی رہے گا۔ اس تبدیلی کو لانے کے لیے تعلیم' رائے عامہ اور سماجی دباؤ (pressure) کے ساتھ ساتھ صحافت' سیاسی جماعتیں' کارکن اور عدلیہ بڑا موثر اور

فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں اور اسی کی ضرورت ہے۔

سوم، عوامی طاقت سب سے موثر عنصر ہے جس کے لیے بڑے پیمانے پر عوامی رابطہ، ان میں اپنے حقوق اور فرائض کا احساس بیدار کرنا اور بالآخر ان کا ایسا mobilisation کہ ان کے عزائم، امنگوں، خواہشات اور ضروریات کو نظرانداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہ رہے۔

اس پس منظر میں ہم عدلیہ کی حالیہ کوششوں کو بڑی تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جمہوریت کے مستقبل کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں۔ عدالتی فعالیت دراصل وقت کا تقاضا اور قیادتوں کے دستور اور قانون سے بے نیاز ہو جانے کا لازمی ردعمل ہے۔ جس طرح ایوب خان کے مارشل لا کے دور میں جسٹس کیانی مرحوم نے جمہوری احیا کی لہر کو پروان چڑھانے میں مثبت کردار ادا کیا، اسی طرح ۲۰ مارچ ۹۶ اور اس کے بعد عدالت عالیہ اور اس کے سربراہ کی خدمات ملک کو دستوریت اور احترام قانون کی طرف لانے کا ذریعہ بنے گی۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا تجربہ منفرد نہیں ہے۔

ہم اس تجزیے کو ختم کرنے سے پہلے چند گزارشات عدلیہ کے ذمہ دار حضرات سے بھی کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنا کردار اور بھی زیادہ موثر انداز میں ادا کر سکیں۔

۱۔ جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں شوریٰ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح خود عدلیہ کے اندر بھی شوریٰ کی موثر روایت قائم ہونی چاہیے۔ اگر عدالت کی حصار بندی اسے سیاسی عناصر کی دخل اندازی سے بچانے کے لیے ضروری ہے تو اس حصار کے اندر بھی ان اصولوں کا احترام اور ان کی ترویج ضروری ہے جو اسلام نے عدل و انصاف اور خیر و فلاح کے حصول کے لیے ضروری قرار دیے ہیں اور یہ مقصد صحت مند دستوری روایات (conventions) کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ عدلیہ کی عزت اور وقار کا اصل انحصار تو اس کے منصفانہ فیصلوں اور حق کے اظہار کے باب میں استقامت پر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے درمیان باہمی اعتماد، تعاون اور ایک دوسرے کے احترام کی جو اعلیٰ روایت ہماری پوری تاریخ میں بشمول حالیہ تاریخ رہی ہے، ان کو قائم رکھا جائے اور مزید مستحکم کیا جائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ باہمی اختلاف کے باوجود عدالت کی وحدت، یک رنگی اور اعتماد باہمی پر کبھی حرف نہیں آیا۔ ججوں کا ایک دوسرے کو "برادر جج" کہنا محض ایک طرز بیان نہیں بلکہ ایک گہرے تعلق اور ادارے کے کلچر کی علامت ہے۔ پچھلے دنوں اعلیٰ عدالت میں اختلاف رائے پیدا کرنے یا موجود ہونے کا جو تاثر سامنے آیا ہے، اسے صحت مند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اختلاف رائے اور ضمیر اور ضابطے کا احترام سب کے لیے ضروری ہے، لیکن معاملات کی صورت گری اور اظہار، دونوں کے آداب ہیں اور یہ آداب کا احترام ہی ہے جو معاملات میں حسن اور توازن پیدا کرتا ہے۔

۳- عدلیہ میں احتساب بھی ضروری ہے تاکہ وہ قوم کا بے لاگ احتساب کر سکے اور زیادہ سے زیادہ شفاف انداز میں کر سکے۔ عدلیہ ہی وہ ادارہ ہے جسے آج بھی سارے بگاڑ کے باوجود ہر شک و شبہ سے بالا سمجھنے کے لیے قوم تیار بھی ہے اور اس کی خواہش مند اور متمنی بھی۔ نیز جمہوریت کی بقا کے لیے بھی یہ بے حد ضروری ہے۔ اس لیے عدلیہ کو خود اپنے نظام کے تحت اس کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

۴- عدلیہ کی اصل کامیابی کا انحصار جہاں دستور اور قانون کے تحفظ پر ہے، وہیں عام انسانوں کو ان کی روز مرہ زندگی میں ظلم سے بچانے اور انصاف مہیا کرنے پر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ہزاروں مقدمات طویل طویل مدتوں سے مختلف سطح کی عدالتوں میں معلق ہیں۔ ہزاروں افراد جیلوں میں اس لیے پڑے ہیں کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ایسے حالات بھی سامنے آئے ہیں کہ جس جرم میں زیادہ سے زیادہ سزا چند متعین سال تھی، ان کے ملزم مقدمے کے فیصلے سے قبل اس سے کہیں زیادہ مدت جیلوں میں سڑتے رہے ہیں۔ انصاف میں تاخیر بھی اتنی بڑی بے انصافی ہے جتنی انصاف کی خلاف ورزی۔ ہر سطح پر ہماری عدلیہ کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے اور ہمارے وکلا کو محض دولت کمانے کو زندگی کا مشغلہ نہیں بنا لینا چاہیے بلکہ جلد، سستے اور مکمل انصاف کی فراہمی میں معاون اور مددگار ہونا چاہیے۔ اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ہمارے تمام دستوری اداروں کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے پھل سے کس حد تک اس ملک کے عوام کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن محض ایک رسالہ نہیں، فی الحقیقت ایک پیغام، ایک دعوت اور ایک تحریک ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس پرچے کو کسی ذاتی یا مالی فائدے کے لیے جاری نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اس کی آبیاری اپنے خون جگر سے صرف اس لیے کی تھی کہ اس کے ذریعے اللہ کے بندوں تک اللہ کے دین کا پیغام پہنچے اور وہ سب سے سچے انسان صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے رب کی بندگی کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے اپنی علمی اور عملی سرگرمیاں وقف کر دیں۔ بس یہی وہ لگن تھی جس نے میرے ساتھی اور رفیق اور ہم آپ سب کے محبوب و محترم بھائی خرم مرادؒ کو بے چین کر دیا اور جب ترجمان القرآن کی ادارت کی ذمہ داری ان پر پڑی تو انھوں نے اپنی ساری توانائی اسے ظاہری اور باطنی لحاظ سے نئی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے وقف کر دی حتیٰ کہ گذشتہ سال دسمبر میں وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ جس کے بعد یہ ذمہ داری میرے اور میرے رفقا کے کمزور کاندھوں پر آ گئی۔

لیکن الحمدللہ ہم بھی اسی جذبے سے سرشار اپنی زندگیاں اس مقصد کے لیے صرف کرنے کو اپنی دنیوی اور اخروی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ خرم بھائی کی دلی خواہش تھی کہ ترجمان القرآن ہر پڑھے لکھے گھر

تک پہنچے۔ انھوں نے اس کی ادارت کی گراں بار ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے ساتھ اس کی اشاعت میں اضافے کے لیے بھی دیوانہ وار کوششیں کیں اور حال یہ ہو گیا کہ:-

جہاں جائیں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگ محفل یاد آتا ہے

الحمدللہ ان مساعی کا نتیجہ بھی نکلا اور ترجمان القرآن کی اشاعت پچیس ہزار تک پہنچ گئی جو اس نوعیت کے رسالوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ان کی یہ رائے تھی' جس کا انھوں نے بار بار اظہار کیا کہ اگر تحریک سے متعلق تمام ساتھی اپنے حصے کی کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اشاعت ایک لاکھ تک نہ پہنچ جائے۔

میں نے اور میرے رفقائے کار نے کوشش کی ہے کہ جن مقاصد کے لیے یہ پرچہ نکالا گیا' جن خطوط پر ہمارے مرشد اور محسن مولانا مودودیؒ نے اسے قائم کیا اور جس انداز میں خرم بھائیؒ نے اسے آگے بڑھایا' انھی خطوط پر اور انھی مقاصد کے لیے ہم مزید آگے بڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور عمومی تاثر بھی یہی ملا ہے کہ پرچے کا معیار قائم رہا ہے اور اس کی اشاعت میں بھی استقلال ہے۔ اب ہماری کوشش ہے کہ دسمبر میں' جس میں خرم بھائیؒ کی یاد کے تازہ جھونکے ہمیں مہمیز دے رہے ہیں' ترجمان القرآن کی اشاعت میں اضافے کی ہر ممکنہ کوشش و تدبیر کریں تاکہ ایک لاکھ کی اشاعت کے ان کے خواب سے قریب تر ہو سکیں۔

میری تمام قارئین سے اور دعوت اسلامی سے وابستہ تمام ساتھیوں سے پرزور ذاتی اپیل ہے کہ وہ اس مہینے میں اس کام کے لیے کچھ نہ کچھ محنت ضرور کریں۔ نئے افراد تک پہنچنا' نئے حلقوں میں اسے متعارف کرانا' اور نئی ایجنسیاں قائم کرنے کی کوشش کرنا ہمیں اس منزل سے قریب لانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے یہ کوشش کی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کو کھول دے گا' ایک چراغ سے دس چراغ جلیں گے' ذہنی اور فکری انقلاب کی لہریں ابھریں گی' سیرت و کردار پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے' دعوت کے لیے نئے قلوب مسخر ہوں گے' اعلاے کلمتہ اللہ کی راہیں ہموار ہوں گی' اقامت دین کی منزلیں طے ہوں گی اور ہم سب اپنے رب کے حضور سرخرو ہوں گے۔ ان شاء اللہ! ہمارا اجر صرف آقا کی رضا ہے لیکن ہماری یہ کوششیں--- خود دنیا سے تاریکیوں کو چھانٹنے اور نور اور روشنی کو پھیلانے کا ذریعہ ہوں گی۔

گم راہی کا ایک اہم سبب

[جو] لوگ "فلاح" اور "خیر" اور "خوش حالی" کا ایک محدود مادی تصور رکھتے [ہیں] ان کے نزدیک جس نے اچھا کھانا' اچھا لباس' اچھا گھر پالیا' جو مال و اولاد سے نواز دیا گیا' اور جسے معاشرے میں نام و نمود اور رسوخ و اثر حاصل ہو گیا' اس نے بس فلاح پالی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ ناکام و نامراد رہا۔ اس بنیادی غلط فہمی سے وہ پھر ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو [جاتے ہیں]' اور وہ یہ --- کہ جسے اس معنی میں فلاح نصیب ہے' وہ ضرور راہ راست پر ہے' بلکہ خدا کا محبوب ہے' ورنہ کیسے ممکن تھا کہ اسے یہ کامیابیاں حاصل ہوتیں۔ اور اس کے برعکس جو اس فلاح سے ہم کو علانیہ محروم نظر آ رہا ہے' وہ یقیناً عقیدے اور عمل میں گمراہ اور خدا (یا خداؤں) کے غضب میں گرفتار ہے۔ اس غلط فہمی کو' جو درحقیقت مادہ پرستانہ نقطہ نظر رکھنے والوں کی ضلالت کے اہم ترین اسباب میں سے ہے' قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے' مختلف طریقوں سے اس کی تردید کی گئی ہے' اور طرح طرح سے یہ بتایا گیا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے---

اس سلسلے میں چند اہم حقیقتیں ایسی ہیں کہ جب تک آدمی ان کو اچھی طرح نہ سمجھ لے' اس کا ذہن کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔

اول یہ کہ "انسان کی فلاح" اس سے وسیع تر اور بلند تر چیز ہے کہ اسے کسی فرد یا گروہ یا قوم کی محض مادی خوش حالی اور وقتی کامیابی کے معنی میں لے لیا جائے۔

دوم یہ کہ فلاح کو اس محدود معنی میں لینے کے بعد اگر اسی کو حق و باطل اور خیر و شر کا معیار قرار دے لیا جائے تو یہ ایک ایسی بنیادی گمراہی بن جاتی ہے جس سے نکلے بغیر ایک انسان کبھی عقیدہ و فکر اور اخلاق و سیرت میں راہ راست پا ہی نہیں سکتا۔

سوم یہ کہ دنیا فی الاصل دارالجزا نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔ یہاں اخلاقی جزا و سزا اگر ہے بھی تو بہت محدود پیمانے پر اور ناقص صورت میں ہے' اور امتحان کا پہلو خود اس میں بھی موجود ہے۔ اس حقیقت کو نظرانداز کر کے یہ سمجھ لینا کہ یہاں جس کو جو نعمت بھی مل رہی ہے' وہ "انعام" ہے اور اس کا ملنا انعام پانے والے کے برحق اور صالح اور محبوب رب ہونے کا ثبوت ہے۔ اور جس پر جو آفت بھی آ رہی ہے وہ "سزا" ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سزا پانے والا باطل پر ہے' غیر صالح ہے' اور مغضوب بارگاہ خداوندی ہے۔ یہ سب کچھ درحقیقت ایک بہت بڑی غلط فہمی بلکہ حماقت ہے جس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دوسری چیز

ہمارے تصور حق اور معیار اخلاق کو بگاڑ دینے والی ہو۔ ایک طالب حقیقت کو اول قدم پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں بے شمار مختلف صورتوں سے افراد کا' قوموں کا اور تمام انسانوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ اس امتحان کے دوران میں جو مختلف حالات لوگوں کو پیش آتے ہیں وہ جزا و سزا کے آخری فیصلے نہیں ہیں کہ انھی کو نظریات' اخلاق اور اعمال کی صحت اور غلطی کا معیار بنا لیا جائے' اور انھی کو خدا کے ہاں محبوب یا مغضوب ہونے کی علامات قرار دے لیا جائے۔

چہارم یہ کہ فلاح کا دامن یقیناً حق اور نیکی کے ساتھ بندھا ہوا ہے' اور بلاشک و ریب یہ ایک حقیقت ہے کہ باطل اور بدی کا انجام خسران ہے۔ لیکن اس دنیا میں چونکہ باطل اور بدی کے ساتھ عارضی و نمائشی فلاح اور اسی طرح حق اور نیکی کے ساتھ ظاہری اور وقتی خسران ممکن ہے' اور اکثر و بیشتر یہ چیز دھوکہ دینے والی ثابت ہوتی ہے' اس لیے حق و باطل اور خیر و شر کی جانچ کے لیے ایک مستقل کسوٹی کی ضرورت ہے جس میں دھوکے کا خطرہ نہ ہو۔ انبیا علیہم السلام کی تعلیمات اور آسمانی کتابیں ہم کو وہ کسوٹی بہم پہنچاتی ہیں' انسانی عقل عام (common sense) اس کی صحت کی تصدیق کرتی ہے اور معروف و منکر کے متعلق نوع انسانی کے مشترک وجدانی تصورات اس پر گواہی دیتے ہیں۔

پنجم یہ کہ جب کوئی شخص یا قوم ایک طرف تو حق سے منحرف اور فسق و فجور اور ظلم و طغیان میں مبتلا ہو' اور دوسری طرف اس پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہو' تو عقل اور قرآن دونوں کی رو سے یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ خدا نے اس کو شدید تر آزمائش میں ڈال دیا ہے اور اس پر خدا کی رحمت نہیں بلکہ اس کا غضب مسلط ہو گیا ہے۔ اسے غلطی پر چوٹ لگتی تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ خدا ابھی اس پر مہربان ہے' اسے تنبیہ کر رہا ہے اور سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے۔ لیکن غلطی پر "انعام" یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے سخت سزا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس کی کشتی اس لیے تیر رہی ہے کہ خوب بھر کر ڈوبے۔ اس کے برعکس جہاں ایک طرف سچی خدا پرستی ہو' اخلاق کی پاکیزگی ہو' معاملات میں راست بازی ہو' خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک اور رحمت و شفقت ہو' اور دوسری طرف مصائب اور شدائد اس پر موسلادھار برس رہے ہوں اور چوٹوں پر چوٹیں اسے لگ رہی ہوں' تو یہ خدا کے غضب کی نہیں' اس کی رحمت ہی کی علامت ہے۔ سنار اس سونے کو تپا رہا ہے تاکہ خوب نکھر جائے اور دنیا پر اس کا کامل العیار ہونا ثابت ہو جائے۔ دنیا کے بازار میں اس کی قیمت نہ بھی اٹھے تو پروا نہیں۔ سنار خود اس کی قیمت دے گا' بلکہ اپنے فضل سے مزید عطا کرے گا۔ اس کے مصائب اگر غضب کا پہلو رکھتے ہیں تو خود اس کے لیے نہیں بلکہ اس کے دشمنوں ہی کے لیے رکھتے ہیں' یا پھر اس سوسائٹی کے لیے جس میں صالحین ستائے جائیں اور فساق نوازے جائیں۔

(تفہیم القرآن' جلد سوم' ص ۲۸۴-۲۸۵)

قرآن روشنی ہے

مسعود مفتی

میں نے سات ماہ مشرقی پاکستان میں بسر کیے۔ ایک ماہ بنگلہ دیش میں گزارا اور پھر دو سال بریلی میں بھارت کا قیدی رہا۔ یہ تاریک دن تھے اور انھی دنوں میں قرآن پاک نے اپنی روشنی ثابت کی جس کی ہلکی سی جھلک آج آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مگر پہلے یہ عرض کر دوں کہ تاریکی سے کیا مراد ہے؟ وہ تاریک دن تھے اور ان کی تاریکی کئی سطح پر تھی۔

پہلی سطح یہ تھی کہ یہ ملت اسلامیہ کے لیے تاریخ کا دوسرا تاریک دور تھا۔ اسلامی تاریخ کا پہلا تاریک دور وہ تھا جب آٹھ سو سال کی حکومت کے بعد ہسپانیہ سے مسلمانوں کا نام تک مٹ گیا تھا۔ مسجدیں خاموش ہو گئی تھیں۔ کلمہ گو تہ تیغ کر دیے گئے تھے۔ نماز کی ممانعت ہو گئی تھی اور جان بچانے کا واحد ذریعہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرنا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہم نے انھی خدشات کے سائے بڑھتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ خاکم بدہن مگر حقیقت یہ ہے کہ آج اس برعظیم میں ہندو وہی ڈرامہ کھیلنا چاہتا ہے جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں سپین میں کھیلا گیا۔ ۱۹۴۸ میں بھارت نے ایک خاص مشن سپین بھیجا تھا جس کا مقصد یہ مطالعہ کرنا تھا کہ اسلام کو اس سرزمین سے کیسے ختم کیا گیا تاکہ اسی چیز کو یہاں بھی دھرایا جا سکے۔ ہسپانیہ بنیادی طور پر نفاق اور غداری کا شکار ہوا اور بھارت نے بڑے دھیمے مگر موثر انداز میں نفاق کے بیج ہمارے ہاں پھیلائے' اور پھر صورت حال بالکل ویسی ہی ہو گئی جیسی کہ ہسپانیہ میں تھی کہ جب فرڈی نینڈ نے اسلامی شہر ملاغہ فتح کیا تو مسلمان حاکم ابو عبدل نے اسے مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ ۱۹۷۱ میں ابو عبدل کی روح زندہ ہو گئی اور بنگالی قومیت کا بھیس بدل کر بھارت کی ہر کامیابی پر سرشار ہونے لگی۔ اس روح کی زندگی ہمارے لیے تاریکی تھی۔

تاریکی کی دوسری سطح اس برعظیم کے مسلمانوں کی سطح تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک تاریک اور طویل عمل کا سیاہ ترین حصہ تھے۔ وہ عمل جو ۱۰۲۶ میں سومنات کی فتح سے شروع ہوا تھا' ۱۹۷۱ میں بالکل پلٹ گیا۔ ۱۰۲۶ میں بت سرنگوں ہوئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بت شکن سرنگوں ہوئے۔ ۱۹۷۱ کا سال قریباً ایک ہزار سال بعد بت

پرستوں کا بت شکنوں سے پہلا بھرپور بدلہ تھا اور یہ بدلہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ قریباً اڑھائی سو سال پہلے ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس برعظیم میں ملت اسلامیہ کا جو زوال شروع ہوا تھا' وہ بلا روک ٹوک جاری رہا۔ اورنگ زیب کے بعد چاروں بیٹوں کی تخت نشینی کی جنگ' سید بھائیوں کی بادشاہ گری' محمد شاہ رنگیلا کے دور میں مختلف صوبوں کی خود مختاری' جنگ پلاسی' مرہٹوں کا عروج اور شاہ دہلی کی بے بسی' بادشاہ دہلی شاہ عالم کا اندھا کیا جانا' پنجاب میں سکھوں کا عروج' دہلی پر لارڈ لیک کا حملہ اور بالآخر ۱۸۵۷ کا خونیں ڈراپ سین' اس مسلسل زوال کی کڑیاں تھیں اور بالآخر اسلامی سلطنت کا چراغ اس برعظیم میں گل ہو گیا۔ ۱۹۴۷ میں جب یہ نعرہ لگا "پاکستان کا مطلب کیا ہے' لا الٰہ الا اللہ" تو یہ خیال پیدا ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد اب اسلامیان ہند کا ستارہ پھر سے روشن ہونے کو ہے مگر جب ہم نے اپنے نظریاتی رنگ کو پس پشت ڈال دیا اور بھرپور منافقت سے زبانی جمع خرچ شروع کیا تو تاریخ سسکیاں بھرنے لگی کہ زوال کا عمل تو اب بھی جاری ہے اور تاریخ کی گونج سے ہم بھی سہم گئے۔ پھر تاریخ نے یاد دلایا کہ ہسپانیہ میں غرناطہ کا سقوط ۱۴۹۲ میں ہوا اور وہاں کے آخری مسلمان نے ۱۶۱۰ میں سانس لینا بند کیا۔ گویا ہسپانیہ کی سرزمین میں اسلام کی آخری ہچکی کو ۱۱۸ برس لگے اور ہم سوچتے کہ کیا ان دو صدیوں کو ہم بھی اسلامیان برعظیم کی آخری ہچکی کا دور سمجھیں۔ یہ خیال اتنا کرب ناک تھا کہ ہم اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبتے گئے۔

تاریکی کی تیسری سطح پاکستانی قوم اور وطن کی سطح تھی۔ اس قوم کی جس نے ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۷ تک کے مختصر عرصے میں وطن حاصل کیا اور حاصل کرتے ہی بھول گئی کہ کیوں حاصل کیا تھا۔ آگہی سے چلی' نا آگہی میں بھٹک گئی۔ منزل مراد پر دم بھر کو رکی' پھر نامرادی کے راستے ہو لی۔ راستے میں یقین کی لاٹھی گم کر دی اور مایوسی میں گم ہو گئی۔ جمعیت پارہ پارہ' کارواں فرد فرد۔ اشتراک کیا تو صرف اتنا کہ سب مل کر قومی مفاد کو دفن کر سکیں۔ اقدار مٹی میں ملائیں' نفسا نفسی کو ایمان بنایا اور بالآخر قوم کی حالت اس کشتی کے مسافروں کی سی ہو گئی جو طوفان میں گھری ہے۔ اوپر بارش' نیچے لہریں۔ مگر ہر مسافر محض اپنے سر کو بارش سے بچانے کے لیے کشتی کے فرش کا تختہ اکھاڑ کر اپنے سر پر آڑ کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ سفر بخیر ہو گا۔

شیخ سعدیؒ نے کہا ہے کہ تین چیزوں کو بقا نہیں۔ مال کو تجارت کے بغیر' علم کو بحث کے بغیر اور ملک کو تدبیر کے بغیر۔ وطن حاصل کرتے ہی ہم نے اس کا نام مملکت خداداد رکھ دیا اور تدبیر کو چھٹی دے دی۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۱ میں بھی میر کارواں نے وطن کو بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی۔ بہت کیا تو تساہل کو تدبیر کہہ ڈالا اور حماقتوں کو نوشتہ تقدیر سمجھ لیا۔ رہبروں کی مسلسل خود ستائی' رہروؤں کی مسلسل خود فریبی' رہزنوں کی مسلسل خود نمائی اور راست گوؤں کی مسلسل خودکشی سے قوم اور وطن ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں تاریکی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ تہی دامنی کے اس احساس کے ساتھ ہم تاریخ کے چوراہے میں حیران و پریشان

کھڑے تھے۔

تاریکی کی چوتھی سطح فرد کی سطح تھی۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں ہر فرد بے بسی اور بے چارگی کی مکمل تصویر تھا۔ امید تھک ہار چکی تھی، خدا ناراض لگتا تھا، سیاست مفلوج تھی، رہبروں پر رہزنی کا گمان گزرتا تھا، گردوپیش سازشیں تھیں، ماحول میں تناؤ اور ہیجان تھا۔ ہمسائے بھی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دھماکے برات کے گولوں کی طرح تھے۔ گولیاں فضا میں پنچھی پکھیروں کی طرح اڑتی تھیں۔ خون کے چھینٹے پان کی پیک کی طرح عام تھے۔ ہر ذی روح کی نس نس میں خوف و ہراس رچا تھا جس سے زبانیں گنگ تھیں اور کوئی دل کھول کر بات نہ کر سکتا تھا۔ ہر شخص ہر لمحے کی اوٹ میں موت کا سایہ دیکھتا تھا۔ بعض لوگوں کے لیے بعض دوسرے لوگ عزرائیل بنے تھے، بنگالی کے لیے ہر فوجی، بہاری کے لیے ہر بنگالی، مغربی پاکستانی کے لیے ہر مکتی باہنی والا اور سب کے لیے وہ نامعلوم پراسرار شخص جو کسی بھی جگہ کسی بھی وقت بم رکھ سکتا تھا۔ ایک وقت کے ہنستے بولتے چہرے دوسرے وقت مرچکے ہوتے تھے یا گرفتار ہو چکے ہوتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے اور وہ موت کو معمول اور اپنی زندگی کو خلاف معمول سمجھتا تھا۔ بعدازاں جنگ آئی، شکست دیکھی، قیدی بنے مگر اس انفرادی نفسیات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ فقط واقعات، حادثات اور خطرات نے نئے نقاب پہن لیے۔

طرز فغاں ہو کہ طرز بیاں، دونوں ایک ربط چاہتے ہیں تاکہ سننے والا سمجھ سکے۔ اس لیے ایک ایک نقطہ علیحدہ علیحدہ بتانا پڑتا ہے جو پورے دکھ یا جذبے کا محض ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس طرح میں نے تاریکی کے چار پہلو، بیان کی ضرورتوں کے تحت گنوائے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شش جہت اور گھمبیر تاریکی تھی جو اتھاہ تھی، اٹوٹ تھی، پیچ در پیچ تھی اور بھنور در بھنور تھی۔ اس میں آنکھ بے کار اور فہم لاچار تھا۔

میں اسے بار بار تاریکی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ فارمولے ماؤف اور موقوف ہو چکے تھے جو ہمیں عام زندگی میں بصیرت اور روشنی دیتے ہیں۔ اس ماحول میں گھرا ہوا فرد کوئی بھی روایتی پیمانہ اٹھا کر حالات کا تجزیہ کرتا تو بہت جلد مایوس ہو جاتا، کیونکہ پیمانہ یا تو ناکافی ثابت ہوتا یا غیر متعلق۔ وہاں ہر لمحے کی آستین میں کئی فتنے تھے اور ہر فتنے کے کئی پہلو تھے اور ہر پہلو کی کئی قسمیں تھیں جو ان تمام پیمانوں کے لیے اجنبی تھیں۔ مذہب، اخلاقیات، عام اقدار اور حیات کے تمام فلسفے تقدیر کی گردش میں ڈوبتے نظر آتے تھے اور تقدیر ایک ان بوجھی پہیلی کی طرح سب کے اعصاب پر چھائی تھی۔ طاقتور، منہ زور اور بے قابو حالات کے سامنے ہر فرد اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور بے بس محسوس کرتا تھا۔ فرد کا زمان و مکان سے رشتہ اس حد تک ٹوٹ چکا تھا کہ پوری کائنات بے مقصد لگتی تھی اور زندگی بے معنی، جو ہوا کے خفیف جھونکے کی طرح ابھی ہے اور ابھی نہیں ہے۔ حالات کبھی تندرو تھے اور کبھی سست رو مگر ان کی گرد راہ سے ذہن میں ایسے ایسے سوالات پیدا

ہوتے تھے جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ مستور تقدیر جب بے نقاب ہو جائے تو مجوب ذہن بے باک ہو جاتے ہیں۔ ان کی سوچ میں اپنا گریبان چاک کرنے والی بے صبری بھی ہوتی ہے اور دامن یزداں چاک کرنے والے گستاخی بھی۔ ان سوچوں سے نکلے ہوئے سوالات وعدۂ فردا پر نہیں ٹل سکتے تھے، وہ جواب چاہتے ہیں--- فوری اور مکمل۔ اور جب جواب نہ ملے تو یہ پریشان ذہن تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تاریک دن تھے تو میری مراد ایسی ہی تاریکی سے ہے۔

مشرقی پاکستان کی خوں ریز قیامتوں اور جنگ کے ہنگاموں میں تو ہم نے اپنی ذات کی حد تک سوچا مگر قید کی بے خواب راتوں میں غالب کے کہنے کے مطابق خیال بھی بیابان نورد ہو گئے۔ سوچوں کا دائرہ ذات سے پھیلا تو کائنات تک گیا اور اس کائنات میں انسان کی حیثیت تک گیا۔ سوچا ہم نے مگر سمجھا اقبال کی زبان میں کہ:۔

مکانی ہوں کہ آزاد مکاں ہوں جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں

منظم اور متحرک کائنات کی لامحدود وسعتوں میں رینگنے والا انسان انتہائی حقیر لگتا اور یہ چند سالہ زندگی بالکل بلامقصد لگتی۔ بقول غالب ؎

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہم سوچتے کہ ہم ہوئے تو کیا ہوا۔ نہ ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔ ہمیں غیر موجود سے موجود میں لا کر پھر غیر موجود میں لے جانے کے کیا معنی؟ بقول فانی:۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

اور ہمارے ہونے کے بھی کیا انداز؟ کہ ورود تو ایسے کہ:؎

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

اور وداع ایسے کہ:؎

بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

اور ان دو کے درمیان زندگی کا یہ انداز کہ:؎

اسیر جسم ہوں میعاد قید نامعلوم

اللہ اور اس کے بندے کے رشتوں سے نظر ہٹتی تو بندے اور بندے کے رشتوں میں جا الجھتی۔ خاردار تاروں میں گھرا ہوا مختصر سا کیمپ، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کے مطالعے کی لیبارٹری تھا۔ اس میں انسانی فطرت کو اس کی بدترین اور بہترین شکل میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم مختار نہ تھے بلکہ مجبور تھے، آزاد نہ

تھے بلکہ محبوس تھے۔ ضروریات کم تھیں مگر وسائل کم تر تھے۔ مقصد حیات سکڑ کر محض اپنی بقا رہ گیا تھا۔ اس لیے سارے جذبے انتہائی شدید شکل میں نظر آتے تھے۔ خود ترسی بھی شدید تھی اور خودغرضی بھی۔ غیروں سے مجروح شدہ انا اپنوں میں بہت مغرور تھی۔ اس لیے عام زندگی میں اچھائی اور برائی کے تصادم کا جو تناسب نظر آتا ہے، وہ بھی کیمپ میں نسبتاً شدید شکل میں نظر آتا تھا اور ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ نیکی اور بدی کے ازلی اور ابدی تصادم میں بدی کیوں زیادہ تر حاوی رہتی ہے؟ یہ سوال صرف باہمی رشتوں کی رگڑ سے نہ اٹھتا تھا بلکہ جب ہم خاردار تاروں کے باہر ہندستانیوں کو دیکھتے تو اور بھی تکلیف دہ بن کر ذہن کو کریدتا۔ ہندو نے چالاکی، مکاری اور جارحیت سے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا۔ اب ترانوے ہزار لوگوں کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی طور پر محض دھونس سے یرغمال بنا رکھا تھا اور پھر بھی دنیا والے اس کا دم بھرتے تھے۔ ہم سوچتے کہ اس دنیا میں خدا نے بدی اور جھوٹ کی قوتوں کا پلڑا بھاری کیوں رکھا ہے؟

میں نے سوالوں کے گتھے ہوئے گنجلک میں سے صرف چند سوال آپ کے سامنے رکھے ہیں، لیکن اگر آپ ہمارے پورے کرب اور کرید کا تصور کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ غیر معمولی حالات، غیر معمولی سوالات کو جنم دیتے ہیں اور ان کا غیر معمولی اثر یہ تھا کہ ہمارا یقین ہر چیز سے ڈول گیا تھا۔ تمام عقیدے لڑکھڑانے لگے تھے یا دیگر الفاظ میں یوں سمجھیے گا کہ اندھے کے ہاتھ سے لاٹھی گر گئی تھی اور ہم مکمل تاریکی میں تھے۔

ایسے وقت میں مجھے قرآن سے روشنی ملی۔

ہمارے مختصر سے کیمپ میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ ایک گروپ عبادت گزار لوگوں کا تھا، جو اپنا زیادہ تر وقت نماز ادا کرنے، قرآن خوانی، آیات کریمہ کے ورد اور ختم قرآن میں گزارتا تھا۔ دوسرا گروپ ان لوگوں کا تھا جو پہلے گروپ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا مگر ان کی عبادت میں وہ شدت نہ تھی۔ گو دعاؤں میں وہی خلوص تھا۔ تیسرا گروپ ان لوگوں کا تھا جو مذہب کے دلدادہ نہ تھے بلکہ ان میں سے دو ایک تو بالکل مخالف تھے.... میں دوسرے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔

ہم سب آپس میں ان سوالوں پر اکثر بحث کیا کرتے تھے جن سوالوں کا میں ذکر کر چکا ہوں اور ہر گروپ کا انداز فکر، طرز استدلال اور جذباتی شدت مختلف ہوتی۔ پہلے گروپ والے ان سوالات کو پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرے گروپ والے کھلے ذہن سے غور کرتے اور تیسرے گروپ والے انھیں خوب خوب اچھالتے۔

ابھی غور و بحث کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ پہلے گروپ والے ایک دوست نے مجھے ایک دن تنہائی میں بڑے خلوص سے سمجھایا کہ ان چیزوں کے متعلق مت سوچا کرو۔ مجھے خطرہ ہے کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے اور

انھوں نے سورہ المائدہ کی آیات نمبر ۱۰۱ اور ۱۰۲ بتائیں:

"اے ایمان والو! ان چیزوں کے متعلق سوال مت کرو جنھیں سمجھ کر تم تکلیف اٹھاؤ گے"۔

"تم سے پہلے بھی بعض لوگوں نے یہ سوالات پوچھے تھے اور گمراہ ہو گئے تھے"۔

گویا انھوں نے فیصلہ سنا دیا: ع

آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اپنے دوست کی اس بات سے میں بہت پریشان ہوا۔ یوں لگا کہ میں تاریکی میں سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں مگر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور وہ تاریکی اتھاہ بن گئی ہے۔ چند دن تک میں انتہائی پریشان ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟

ہمارے کیمپ میں ترجمے والے دو تین قرآن مجید تھے۔ دو تو اردو ترجمے تھے جن میں سے ایک جناب سید عبدالقادرؒ صاحب کا تھا اور دوسرا جناب عبداللہ یوسف علیؒ صاحب کا انگریزی ترجمہ۔ ان نسخوں کو ہمارے کیمپ کے ساتھی باری باری پڑھا کرتے تھے۔ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات بنا رکھے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ تھوڑا عرصہ بالترتیب پارہ پارہ پڑھا۔ مگر بعد میں یہ طریقہ چھوڑ دیا اور جب کبھی کوئی سوچ زیادہ تنگ کرتی تو قرآن مجید کی ورق گردانی کر کے مختلف مقامات سے اس کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔

میرا سب سے پہلا سہارا سورہ نحل کی آیت نمبر ۶۹ تھی جس میں خدائے تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی مثال دے کر فرمایا کہ یہ ایک مثال ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ پھر ایسے ہی فقرے بار بار نظر سے گزرے اور یتفکرون کے لفظ کی تکرار سے غور و فکر کرنے والے اصحاب کی نشان دہی کی گئی ہے۔ خود قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کتاب الحکیم ہے اور "قرآن مبین" ہے جو حکمت والی کتاب ہے اور چیزوں کو واضح کرتی ہے۔ اسی وضاحت کے لیے مکڑی کے جالے کی مثال دی گئی ہے (العنکبوت ۲۹:۱-۲)، جھوٹے خداؤں اور مکھی کی مثال دی گئی ہے (الحج ۲۲:۷۳)، گدھے کی مثال دی گئی ہے (الفتح ۴۸:۲۴)، اور سوت کاتنے والی عورت کی مثال دی گئی ہے (النحل ۱۶:۹۲)۔ یہ مثالیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں اور روشن ضمیری کے ساتھ ساتھ روشن دماغی کو بھی جائز قرار دیتی ہیں۔

یہ احساس میرے لیے اس تاریکی میں روشنی کی پہلی کرن تھی جس سے میرے لڑکھڑاتے ہوئے یقین کو بڑی ہی تقویت پہنچی۔ اس کرن کا براہ راست اثر یہ ہوا کہ کیمپ میں پہلے گروپ سے میرا جذباتی رشتہ تو قائم رہا مگر ذہنی رشتہ ٹوٹ گیا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، قرآن خوانی کی محفلوں میں میری شرکت کم ہوتی گئی اور اکیلے میں قرآن فہمی کی کوشش زیادہ ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے گروپ والے دوستوں میں سے بعض کو یقین آ گیا کہ میں گمراہ ہو گیا ہوں اور ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہوں، مگر ان کا الزام سن کر میں صرف مسکرا دیا

تعلیم ؏

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہماری تاریکی کے کئی پہلو اور کئی سطحیں تھیں۔ ان میں سے تین واضح تھے: ملت اسلامیہ کے متعلق پریشانی' اسلامیان برعظیم کے متعلق پریشانی اور پاکستانی قوم کے متعلق پریشانی۔ اس پریشانی کے تحت ہم اپنی قوم کا دوسری قوموں سے مقابلہ کرتے اور اپنے آپ کو مظلوم گردانتے ہوئے اقبال کے انداز میں شکوہ کرتے :۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مگر جب بار بار قرآن میں جھانکا تو خود ترسی پگھل کر خود بینی میں ڈھلنے لگی جس نے بالآخر خود ملامتی کا روپ دھار لیا کیونکہ قرآن پاک نے قوموں کے اجتماعی طرز عمل کا نہایت واضح انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ہر شخص اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے فرد کے بیان میں تشنگی محسوس کر سکتا ہے مگر قوموں کے بیان میں تشنگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ انسان کی ابتدا سے لے کر نزول قرآن تک وقت کے پردے پر متعدد قوموں کے زوال کی تصویر دیکھنے میں آتی ہے اور قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ خداے تعالیٰ نے ریاضی کے فارمولوں کی طرح چند بنیادی اصول بتائے ہیں جن پر قوموں کی حیات و موت کا دارومدار ہے۔

سب سے پہلا اصول سورہ انبیاء میں بتایا گیا ہے :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (الانبیاء ۲۱:۱۶)' "ہم نے زمین اور آسمان کو کھیل یا مذاق کے طور پر نہیں بنایا"۔

یہ وہی بات ہے جو ہماری سائنس بھی سمجھاتی ہے کہ کائنات میں ایک سکیم' تنظیم اور نظم و ضبط ہے اور قرآن کریم میں بار بار ولو شاء اللہ کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ "یعنی اگر اللہ چاہتا" جو وضاحت کرتا ہے کہ دنیا جیسی بھی ہے اس کو بنانے میں خداے تعالیٰ کے دانستہ ارادے کا دخل ہے۔ اگر خدا چاہتا تو اسی کائنات کو دیگر انداز میں بھی بنا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ سب کچھ ایک خاص سکیم کے تحت ہے۔

دوسرا اصول سورہ الاعراف میں نظر آتا ہے:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ - يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ - وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف ۷:۱۲۸)' "بلاشبہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام متقیوں کے لیے ہے"۔

یہ اصول اس سکیم کا بنیادی عنصر ہے جسے اقبال نے ایک مصرعے میں یوں سمویا ہے:؏

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

یہ محض ایک قرآنی آیت ہی نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس قوم نے بھی مومن جیسی خصوصیات پیدا کرلیں، وہ بلالحاظ مذہب و ملت دوسری قوموں پر غالب ہوئی۔ یہ خصوصیات ہیں: دیانت داری، محنت، اخلاقی جرات اور خلوص جب کہ شکست کھانے والی خصوصیات ہیں: منافقت، کاہلی اور بے یقینی۔

تیسرا اصول بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ جب قوم کا کردار بگڑ جاتا ہے تو بالکل ریاضی کے فارمولے کے انداز میں وہ زندہ رہنے کا حق کھو دیتی ہے۔ سورہ انعام میں واضح ارشاد ہے:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (الانعام ۶:۶)، "کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قومیں تباہ کی ہیں۔ ایسی نسلیں جو روے زمین پر ان سے بھی زیادہ طاقت ور تھیں۔ ہم نے ان پر باران رحمت کی اور پاؤں تلے زرخیز ندیاں دیں۔ مگر ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں تباہ کیا اور ان کے بجائے نئی قومیں پیدا کیں"۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ ان قوموں کی سلسلہ وار ہلاکت سے آنے والی نسلیں سبق سیکھ سکتی ہیں اور حقیقت معلوم کرسکتی ہیں۔ سورہ الحاقہ کی پہلی گیارہ آیات اس اصول کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کرتی ہیں کہ اگر تم اصل حقیقت اور سچائی کو پہچاننا چاہتے ہو تو قوم ثمود اور قوم عاد کی ہلاکت کو دیکھو اور طوفان نوح کی تباہ کاریوں کو دیکھو اور بارہویں آیت میں ارشاد ہے کہ ان کا تذکرہ تمھارے لیے ایک سبق ہے۔

پانچواں اصول ایک تنبیہ کی طرح سارے قرآن میں بکھرا ہوا ہے۔ اس کی صرف تین مثالیں پیش کرتا ہوں:

سورہ الحجر میں ارشاد ہے: **وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (الحجر ۱۵:۴)**، "ہم نے کبھی کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا۔ تاوقتیکہ اس کو زندگی کا مقررہ موقع نہیں دیتے"۔

اسی طرح سورہ نحل میں درج ہے: **وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى - فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (النحل ۱۶:۶۱)**، "اگر اللہ انسانوں کو ہر گناہ کی سزا دیتا تو زمین پر ایک نفس بھی زندہ نہ بچتا۔ مگر وہ ان کو ایک معینہ مدت کے لیے مہلت دیتا ہے۔ جب وہ مہلت ختم ہوتی ہے تو ایک ساعت کی تاخیر کے بغیر سزا دیتا ہے"۔

پھر سورہ اعراف میں ارشاد ہے: **وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ - فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً (الاعراف ۷:۳۴)**، "ہر قوم کو ایک وقت دیا جاتا ہے جب ان کی میعاد ختم ہوتی ہے تو اس میں کوئی اضافہ

نہیں کیا جا سکتا"۔

ان اصولوں کی مزید وضاحت ان چھ قوموں کی تباہی سے ہوتی ہے جن کا قرآن میں بار بار ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم طوفان کے ذریعے تباہ ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف پیغمبر کی نافرمانی کی بلکہ اپنی دنیاوی دولت کے نشے میں نوح پر پھبتیاں کسیں کہ تم غریبوں کو اپنی جماعت سے خارج کر دو تو ہم تمھارا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ یعنی انھوں نے اطاعت کو سماجی طبقوں کی شرط کے تابع بنا کر ایمان اور خلوص کا مذاق اڑایا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد اس لیے تباہ ہوئی کہ مالی خوش حالی کے نشے میں لوگ خدا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے پر غرور محلات، مرغزار اور نہریں آندھی میں ٹوٹ پھوٹ گئے۔ حضرت صالحؑ کی قوم ثمود مادی دولت کی حرص میں انسانیت سے اس حد تک خالی ہو گئی کہ اس خشک علاقے میں وہ لوگ جن کا پانی پر قبضہ تھا، دوسروں کو پانی استعمال نہ کرنے دیتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ پانی اور چراگاہیں خدا کا آزادانہ عطیہ ہیں اور ایک اونٹنی کو کھلا چھوڑ دیا تاکہ یقین ہو سکے کہ جانوروں کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر مادی دولت کی حرص میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے اس اونٹنی کو قتل کر دیا اور وہ قوم بالآخر زلزلے سے تباہ ہوئی ---- حضرت لوطؑ کی قوم اپنی فحاشی کی وجہ سے آگ اور پتھر کے طوفان سے تباہ ہوئی ---- حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین اس لیے تباہ ہوئی کہ وہ کم تولتے تھے۔ شاہراہ پر ڈاکے ڈالتے تھے۔ باہمی نفاق رکھتے تھے اور غلط ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو مذہبی کاموں پر خرچ کرتے تھے.... بنی اسرائیل کی تباہی اس لیے ہوئی کہ وہ سچ اور جھوٹ کو ملاتے تھے۔ خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتے تھے۔ خدا کے احکام کی تعمیل میں حجت بازی کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عہد سے بد عہدی کرتے تھے اور مسلسل منافقت سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے سامری کے بچھڑے کی پوجا کر کے شرک کیا۔ ارض مقدس پر حملہ کرنے سے انکار کر کے نافرمانی کی۔ ان پر جب سزا کے لیے ٹڈی دل، مینڈک اور خون وغیرہ کی وبائیں نازل کی گئیں تو انھوں نے توبہ کی۔ مگر جب حضرت موسیٰؑ کی دعا پر یہ وبائیں دفع ہو گئیں تو وہ پھر منکر ہو گئے۔

جس وقت میں قرآن مجید میں یہ واقعات پڑھتا تھا، تو میرا مسکن ایک بے رونق اور ویران کمرہ تھا۔ میرے ارد گرد خاردار تار، بندوقیں اور سنگینیں تھیں۔ فضا میں دشمن کی خوں خوار نظریں تھیں۔ ذہن میں خاک و خون کی یادیں تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اپنی فوج کی شکست کے مناظر تھے۔ دل پر بھارتیوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلت کے زخم تھے۔ لاشعور میں اس برعظیم کے مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت اور دو سو سالہ زوال تھا۔ ہاتھوں میں قوموں کے بننے اور بگڑنے کی داستانیں تھیں جن پر خدا کے غضب کے تازیانے صاف نظر آتے تھے اور شش جہت وہ تاریکیاں تھیں جن کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

ماحول کا ہر تار و پود جب ناموافق نظر آتا تو اداس اور ویران کمرے کی گھٹن میں، میں اپنے من میں

ڈوب جاتا اور رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ قرآن پاک وہ کتاب نہیں جسے علامہ اقبال نے بڑے دکھ سے کہا تھا: ع

کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراق

بلکہ اس کے اوراق تو میرے گردوپیش چھائی ہوئی تاریکی میں شیشے کی مانند چمک رہے تھے۔ جب زیادہ غور سے پڑھا تو یہ شیشہ نہ رہا بلکہ روشن آئینہ بن گیا جس میں اپنی قوم کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔

اس چہرے کے خدوخال مجھے پکار پکار کر بتا رہے تھے کہ جو کچھ ہماری قوم کے ساتھ ہوا ہے' وہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا بلکہ یہ بھی خدائے تعالیٰ کا کرم ہے کہ کم ہوا ورنہ ریاضی کے ان فارمولوں کے مطابق تو بہت زیادہ ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک دفعہ پھر ان اصولوں اور اپنی قوم کا موازنہ کیا تو بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی اور ہمارے گردوپیش جو سوال ناچتا رہتا تھا کہ قصور کیا ہے؟ وہ ٹوٹے تارے کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر گیا اور اس کی جگہ ایک واضح اور روشن جواب ابھرا۔

جواب یہ تھا کہ جن چھ قوموں کو خدا کی طرف سے سزا ملی' ان میں سے ہر ایک میں چند خرابیاں تھیں جو اس قوم کے لیے مخصوص تھیں مگر حیف یہ ہے کہ پاکستانی قوم میں مجموعی طور پر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں' جو فرداً فرداً ہر قوم میں تھیں۔

ہمارا نعرہ یہ تھا "پاکستان کا مطلب کیا؟.... لا الٰہ الا اللہ" یہ صرف نعرہ نہ تھا بلکہ خدا اور دنیا کے ساتھ ایک وعدہ بھی تھا کہ ہم ان اقدار پر مبنی ایک معاشرہ تعمیر کرنے کے لیے ایک خطہ زمین چاہتے ہیں جس میں ہمارا اسلامی کلچر محفوظ رہ سکے۔ مگر یہ خطہ حاصل کر لینے کے بعد ہم ٹھیک بنی اسرائیل کے انداز میں بدعہدی کے مرتکب ہوئے۔ بنی اسرائیل نے سونے کے بچھڑے کی پوجا کر کے شرک کیا۔ ہم نے رات بھر میں امیر ہونے کی خواہش میں دولت کی پوجا اس انداز میں کی کہ شرک کے درجے تک پہنچ گئے۔ بنی اسرائیل کو تنبیہ ہوئی:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۴۲)' "سچ کو جھوٹ سے نہ ڈھانکو اور سچ کو مت چھپاؤ جب تم جانتے ہو"۔

مگر یوں لگتا ہے کہ یہ تنبیہ عین ہمارے لیے گھڑی گئی کیونکہ ہمارے ہاں اخلاقی جرات کا اس قدر قحط ہے کہ سچ قسم کی چیز ہمارے معاشرے میں سے تقریباً ناپید ہوتی جا رہی ہے اور ہر مصلحت کوش زہر ہلاہل کو قند کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کی منافقت' ناشکری اور ناقدری ہمارے اپنے ماتھے کا پسینہ معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین کو اس لیے سزا ملی کہ وہ کم تولتے تھے' شاہراہ پر

ڈاکے ڈالتے تھے اور ناجائز دولت کو مذہبی کاموں پر خرچ کرتے تھے اور آپس میں نفاق رکھتے تھے۔ ان چاروں برائیوں میں سے کون سی برائی ایسی ہے جو ہماری قوم میں اس قوم سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم کو نافرمانی کی سزا ملی مگر اس نافرمانی کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ امیر لوگ حضرت نوحؑ سے کہتے تھے کہ آپ اپنے دین میں سے نچلے طبقے کے لوگوں کو خارج کر دیں۔ پاکستانی قوم نے اس طبقاتی رعونت کی لاتعداد مثالیں دیکھی ہیں۔ قوم عاد اور ثمود کو اس لیے سزا ملی کہ وہ دولت کی فراوانی اور شان و شکوہ کی دوڑ میں انسانیت گنوا بیٹھے۔ ہماری قوم بھی عرصے سے انسانیت کی لاش کے سرہانے بیٹھ کر دولت سمیٹنے میں مصروف ہے۔

قید کے دنوں میں گردوپیش کی تاریکی جب قرآن کی روشنی سے دور ہوئی تو اس آئینے میں اپنی قوم کا تاریک چہرہ نظر آیا جس پر مشرقی پاکستان کے المیے کی تفسیر اتنی واضح تھی کہ ملت اسلامیہ، اسلامیان برعظیم اور پاکستانی قوم کے متعلق میرے سارے سوالات دم توڑ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین سے نعرۂ تکبیر کیوں غائب ہو گیا تھا؟ اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی شکست ہماری قوم پر کیوں پڑی تھی؟ ترانوے ہزار پاکستانی جنگی قیدی کیوں بنے تھے اور جب وہ پابجولاں لے جائے جا رہے تھے تو ان پر ان کے بھائیوں نے پتھراؤ کیوں کیا تھا؟ کیمپ میں ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے دودھ کو کیوں ترستے رہے؟ شانتی پاڑا میں اجتماعی قبریں کیوں بنیں؟ بدی کی قوتیں ہم پر کیوں مسلط ہوئیں؟ بت شکنوں پر بت پرست کیوں غالب آئے؟

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ماضی میں تباہ ہونے والی قوموں کی جملہ برائیوں کو جب ہم نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تو ہمیں سزا دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس سزا میں سیاسی صدمہ بھی شامل کرنا تھا۔ جسمانی، ذہنی اور جذباتی صدمہ بھی شامل کرنا تھا۔ سماجی صدمہ بھی شامل کرنا تھا اور میں جو یزداں کا دامن پکڑ کر شکوہ کرنے اٹھا تھا، اپنی پیشانی سے شرمندگی پونچھتا ہوا بیٹھ گیا۔

یہاں تک مطمئن ہونے کے بعد اب میرے سامنے سوال کا دوسرا حصہ تھا کہ جب کسی قوم کو سزا دی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ دوسرے بعض کے مقابلے میں زیادہ صدمہ اٹھاتے ہیں۔ کسی کے بچے پاکستان میں محفوظ ہیں اور کسی کے بچے کو کیمپ میں دودھ تک نہیں ملتا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس کا بڑا ہی واضح جواب سورہ بقرہ میں ملا: وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (البقرہ ۲:۱۵۵)، "ہم تمھیں آزمائیں گے خوف سے، بھوک سے، جان و مال کے نقصان سے۔ اور خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جو صبر سے یہ سب جھیلتے ہیں"۔ اور پھر سورہ آل عمران میں ارشاد ہے: لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ (آل عمران ۳:۱۸۶)، "یقیناً مال اور جان سے تمھیں آزمایا جائے گا"۔

ان آیات کا مطالعہ میرے لیے بہت فکر انگیز ثابت ہوا۔ میں نے ماضی کو کھنگالا تو احساس ہوا کہ عین اس وقت جب میں بہت مسرور لمحے گزار رہا تھا، ہمارے گردوپیش کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ میری آزمائش قید میں ہوئی۔ کسی کی غربت میں، کسی کی بھوک میں اور کسی کی کسی اور نقصان سے۔ جب دوسروں کی آزمائش ہو رہی تھی، میں خوش و خرم تھا اور میں نے ان کے حق میں خدا سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ اب میری آزمائش ہو رہی ہے اور دوسرے آرام سے ہیں۔ خدا کے پروگرام کے مطابق دوسروں کا حصہ دوسروں کو ملتا رہا اور میرا حصہ مجھے اب مل رہا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے مجھے انتہائی اختصار سے کام لینا پڑا اور میں فکرونظر کے اندیشوں کی پیچیدگیوں کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کر سکا جتنی ضرورت تھی۔ حکایتوں اور شکایتوں کا بیان ہمیشہ طوالت چاہتا ہے اور واردات قلبی کو سمجھانے کے لیے گریبان و دامن کے ہر تار اور گرہ کو الٹ پلٹ کر دکھانا پڑتا ہے۔ میں نے تو مثال کے طور پر تاریک دنوں میں چند سوچیں اور ان سے پیدا ہونے والے چند سوالات آپ کے سامنے رکھے ہیں اور روشنی ملنے کے عمل کی تشریح کی ہے۔ اس عمل کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کی ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کے متعلق ہے اور جس سے سب کا مشترکہ رشتہ ہے۔ اپنی ذات یا فرد کی ذات کے مسئلے کو میں نے ابھی تک چھوا نہیں کیونکہ ایک تو وقت کی کمی ہے اور دوسرے ہر فرد کی ذات اپنے اندر ایک دنیا ہوتی ہے۔ پھر ہر فرد کی دنیا ہر دوسرے فرد کی دنیا سے الگ ہے۔ اس لیے ہر فرد کو بنیادی طور پر اپنا جواب خود ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ پھر بھی ایک فرد اپنا تجربہ اور واردات دوسروں کے سامنے بیان کر سکتا ہے اور میں بھی کر سکتا ہوں مگر:

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

واردات قلبی کا وہ حصہ جو فرد اور ذات کے متعلق ہے، میں کسی دوسری تحریر میں بیان کر رہا ہوں۔ اس وقت گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرد کے متعلق ابھی تک میرے کئی سوال تشنہ ہیں جیسا کہ میں شروع میں ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرا ذہنی سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ بلکہ جاری ہے اور قرآن کے اوراق سے روشنی ڈھونڈنے کی کوشش جاری رہے گی۔ میں اپنا یہ مضمون سورہ ہود میں حضرت آدمؑ کی اس دعا پر ختم کرتا ہوں:

رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ۔ (ہود ۱۱:۴۷)

"اے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں بلاتردد اس بارے میں تجھ سے سوال کروں جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو"۔

(تلخیص کی خاطر، کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ مضمون مصنف کی کتاب 'لمحے' میں شامل ہے۔ مدیر)

نسخہ شفا اور دست شفا

خرم مرادؒ

میڈیکل ڈاکٹروں میں اسلامی فکر و عمل کی داعی' پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (پیا) کے سالانہ کنونشن میں' خرم مراد مرحوم نے یہ خطبہ دیا۔ اس خطبے میں دعوت اسلامی کی تڑپ اور امنگ بیدار کرنے کے لیے جو اشارات بیان کیے گئے ہیں' ان کے مخاطب صرف طبی ماہرین ہی نہیں ہیں' بلکہ اپنی جگہ پر ہر فرد کے لیے اس میں پیغام دعوت ہے۔ یہ خطاب ٹیپ کی مدد سے پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

صدر محترم اور میرے عزیز بھائیو!

جب بغیر موضوع کے بولنا ہو تو ذہن کو کافی آسانی اور وسعت نصیب ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس محفل کے حوالے سے تین نقوش میرے ذہن میں ابھر کر آئے ہیں' انھی سے اپنی گفتگو کا آغاز کروں گا۔

چند دن پیشتر امریکہ کے جریدے ٹائم میں ایک مضمون آیا تھا: Medics With a Mission یعنی وہ ڈاکٹر جو ایک مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ اس میں ان ڈاکٹروں کی تفصیل تھی' جو اپنے گھربار اور اپنی پریکٹس چھوڑ کر ایسے علاقے میں لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے تھے جہاں شدید خطرات انگیز کرنا پڑتے تھے۔ وہ اپنے علم اور اپنے فن کو ان مجبور اور مظلوم لوگوں کی خدمت پر لگا رہے تھے جو جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار تھے۔ یہ مقامات افغانستان' فلپائن' برما' کمپوچیا' غزہ اور اس قسم کے دوسرے مقامات تھے۔ یہ سب ڈاکٹر بڑے ماہر اور اپنے پیشے میں بڑے نامور تھے۔ یہ اگر اپنے گھروں میں رہتے' اور اپنے شہروں میں پریکٹس کرتے تو لاکھوں ڈالر ماہوار سے کم نہ کماتے۔ دولت اور آرام تو ایک طرف' خود ان کی جانیں بھی سخت خطرے میں تھیں' اس لیے کہ اردگرد چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں' جنگی جہاز پرواز کر رہے تھے اور بم برس رہے تھے۔ ان ڈاکٹروں میں سے کوئی مسلمان نہیں تھا۔ میں یہ نہیں کہتا مسلمان ڈاکٹر ایسے نہ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ٹائم نے تو انھی ڈاکٹروں کو ابھارنا تھا جو مسلمان نہ تھے۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے مسلمان ڈاکٹر بہرحال کم ہی ہوں گے۔ یہ پہلا نقش تھا جو میرے ذہن پر ابھر کر آیا۔

دوسرا نقش جو بچپن میں تاریخ کے مطالعے سے حافظے میں نقش ہو گیا تھا' وہ تازہ ہوا اور مجھے یاد آیا

جب ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی آئی' اس زمانے میں بنگال' احمد آباد اور دیگر مختلف جگہوں پر مغل بادشاہوں اور مسلمان حکمرانوں سے فرانس' پرتگال اور برطانیہ کے جن لوگوں نے اس کمپنی کے لیے مراعات حاصل کیں' تجارتی کوٹھیاں بنانے کے لیے زمین حاصل کی' محصولات میں رعایتیں حاصل کیں' ان میں کلیدی رول ادا کرنے والے ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے اپنے علم اور فن کے بل پر عوام کی خدمت تو نہیں کی' جس طرح Medics With a Mission اب کر رہے ہیں' لیکن انھوں نے اس علم و فن کو اسلام کی نفی' اپنے قومی اور تہذیبی اغراض کی پیش رفت کے لیے اس طرح استعمال کیا کہ اپنی قوموں کے لیے ہندستان کی سرزمین میں ایک ایسی جگہ حاصل کرلیں جہاں سے وہ آگے بڑھ سکیں۔ انھی کی حاصل کردہ یہ تجارتی مراعات ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈچ ایسٹ کمپنی کو ملیں جنھوں نے بالآخر ہندستان کو انگریزوں کی گود میں لا کر ڈال دیا۔ یہ کہانی صرف ہندستان ہی میں نہیں دہرائی گئی' بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے مسلمان اور غیر مسلمان ملکوں میں بھی دہرائی گئی۔ ڈاکٹروں نے اس میں ایک ہراول دستے کا کام کیا۔ اسی کے اندر وہ مشنری بھی تھے' جن کے اغراض و مقاصد سیاسی نہیں بلکہ مذہبی تھے۔ آج بھی دنیا بھر میں Medics With a Mission کے تحت جنگ سے تباہ شدہ علاقوں میں جو ڈاکٹر کام کر رہے ہیں' مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ان کے مقاصد بھی مذہبی ہوں گے۔ یہ ڈاکٹر تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک کامیاب کیریر پر گامزن ہوئے' پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر افریقہ کے جنگلوں' صحراؤں' بیابانوں اور ویرانوں میں جا کر بس گئے۔ انھوں نے امریکہ اور یورپ کی عیش پرستانہ اور آرام دہ زندگی کو تیاگ دیا اور وہاں پر جذام' برص' کوڑھ اور دوسرے امراض میں مبتلا مریضوں کے ساتھ مل جل کر کام کیا۔ اس عمل کی بے شمار کہانیاں لٹریچر کے اندر موجود ہیں۔ آج اگر افریقہ میں عیسائیت سب سے بڑا مذہب بن گئی ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے' تو اس کی داغ بیل بھی انھی ڈاکٹروں نے ڈالی ہے۔ یہ تاریخ کے مطالعے کا دوسرا نقش تھا جو میرے ذہن پر ابھر کر آیا۔

تیسرا' آج سے تقریباً دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے' مکہ معظمہ میں یمن کی اسلامی تحریک کے راہ نما سے میں وہاں کے حالات پر گفتگو کر رہا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا: "ہمارے پاس صرف دس ڈاکٹر ہوں' جو سب کچھ تج کر' یمن کے دیہاتوں اور قصبوں میں آکر بیٹھ جائیں' وہاں پر اپنی طبی مہارت سے لوگوں کا علاج کریں تو ہم بہت جلد یمن میں اسلامی انقلاب لا سکتے ہیں۔ ہمیں صرف دس ڈاکٹروں کی ضرورت ہے' جو اپنا کیریر قربان کر کے اور سب کچھ چھوڑ کے آجائیں۔ چاہے وہ زبان بھی نہ جانتے ہوں' کیونکہ زبان کم کام کرتی ہے' اس کے مقابلے میں خدمت زیادہ کام کرتی ہے"۔ ان کی یہ بات میرے دل پر نقش ہو گئی۔ ان تین نقوش کو آج میں نے آپ کے سامنے گفتگو کے آغاز میں ہی پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر کو یہ بے پناہ طاقت کس لیے حاصل ہوتی ہے؟

ظاہر ہے کہ ان کے پاس مادی طاقت نہیں ہوتی، فوجی قوت نہیں ہوتی، ان کے پاس علم و فن ہوتا ہے۔ علم و فن تو اور بہت سارے لوگوں کے پاس بھی ہوتا ہے، انجینئرز کے پاس ہوتا ہے، دیگر بہت سارے پیشے بھی اس علم و فن سے آراستہ ہوتے ہیں، لیکن ڈاکٹروں کو یہ خاص طاقت کس لیے حاصل ہوتی ہے؟ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹروں کی طرف انسان خود رجوع کرتا ہے۔ اور اعتماد کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔ ابلاغ میں کسی بات کو قبول کیے جانے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کہنے والا سننے والے کے پاس آیا ہے یا سننے والا کہنے والے کے پاس گیا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس آیا ہے یا پیاسا کنویں کے پاس گیا ہے۔ اور کہنے والے کی بات پر کتنا اعتماد ہے، کتنا بھروسہ ہے اور کتنی امید ہے؟ چنانچہ ڈاکٹر مرجع ہوتا ہے۔ لوگ خود اس کی طرف آتے ہیں۔ پھر اس کے فن کا تعلق انسان کے اس وجود سے ہے، جو دراصل اس کی بات کا ہدف ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ آتا اپنے جسمانی امراض کے علاج کے لیے ہے، تاہم انسان ایک وحدت ہے، جسم، روح، قلب اور ذہن سب یکجا ایک ہی وجود کا حصہ ہیں۔ اس لیے وہ اپنی ان ضروریات کے لیے ڈاکٹر کے پاس آتا ہے، جو اس کے جسم کی بھی ہوتی ہیں اور اس کے نفس اور دل کی گہرائی سے بھی اٹھتی ہیں۔ وہ کبھی کرب کے عالم میں کبھی الم کی کیفیت اور کبھی تکلیف کی حالت میں بے قرار ہوتا ہے۔ کبھی مضطرب، کبھی پریشان اور کبھی بے چین ہوتا ہے۔ اس حالت میں ہوتا ہے جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس طرح دی ہے کہ کشتی سمندر میں جا رہی ہو، سمندر میں طوفان آ جائے اور کشتی ڈوبنے لگے تو اس وقت تو بڑے سے بڑا زندیق اور کافر بھی اسی نادیدہ قوت کو پکارتا ہے، جس کے دست قدرت میں، زمین، دریا، ہوا، پانی اور سب کچھ ہیں۔ تقریباً اسی سے ملتی جلتی کیفیت اس مریض کی ہوتی ہے، جو کرب و الم اور درد و اذیت سے بے چین ہو کر ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ اصل سرچشمہ ہے ڈاکٹر کی قوت کا۔

آپ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے اختتامی اجلاس کا ان واقعات سے کیا تعلق ہے؟

میرے خیال میں ان واقعات کا اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے میرے ذہن نے ان واقعات کو تازہ کر دیا اور میں نے انھی کے گرد اپنی گفتگو کا تانا بانا بننے کا فیصلہ کیا۔ اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن، ڈاکٹروں کی ایک تنظیم ہے۔ لیکن یہ محض ڈاکٹروں کی ایک تنظیم نہیں ہے۔ اس لیے کہ ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشنز اور بھی بہت ساری ہیں۔ خود اس ملک میں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن موجود ہے۔ اسی طرح کی ایک تنظیم نے اپنے نام کے ساتھ اسلامک کے لفظ کا بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ اضافہ یقیناً کسی مقصد، کسی غرض اور کسی ہدف کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ لفظ سوچ سمجھ کر بڑھایا گیا ہو

گا۔ یہ صرف' تقلید' نقالی اور بے سوچے سمجھے کی کارروائی نہیں ہو گی' بلکہ وہ ڈاکٹر صاحبان جو پڑھے لکھے ہیں' باشعور ہیں' انھوں نے ضرور اس کے مفہوم' تعبیر اور مضمرات کو سامنے رکھ کر ہی اس بات کا فیصلہ کیا ہو گا کہ یہ لفظ اس کے ساتھ ہونا چاہیے--- یہ لفظ کیوں لگایا گیا؟ اور یہ واقعات جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے' ان کا تعلق اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن سے کیوں ہے؟

اصل میں یہ کیوں کا سوال بڑا ہی عجیب سوال ہے' اس کیوں کے دامن میں اتنے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں کہ انسان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ بظاہر یہ بڑا آسان سوال ہے' لیکن اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ سوال ہمیشہ حق' عرفان حقیقت اور سچائی کی خبر لے کر آتا ہے۔ تحقیق کا اصول بھی یہ ہے کہ آدمی پہلے سوال قائم کرے پھر ان کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ علم میں پیش رفت' جواب کی جستجو اور تحقیق کے دروازے اسی طرح کھلتے ہیں۔ وہی فلسفی' سائنس دان اور تحقیق کار آگے بڑھ سکتا ہے' جو پہلے کیوں اور کیسے کا سوال متعین کرتا ہے اور پھر اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ "میں ایک دھڑکتے دل' سوچنے والے دماغ اور حرکت کرنے والے ہاتھ پاؤں کے ساتھ اس صفحہ ارضی پر کیوں پایا جاتا ہوں؟" دنیا کے سارے فلسفے' تمام مذاہب اسی سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں اور کس لیے آئے ہیں۔ اس "کیوں" کے سوال سے نئی دنیا اور نئے جہاں تعمیر ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ اپنے اندر معنی اور تقاضوں کا ایک جہاں سمیٹے ہوتا ہے۔

چنانچہ سوال یہ ہے اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کیوں قائم کی گئی؟ اور پھر اس کے ساتھ اسلامک کے لفظ کا اضافہ کیوں کیا گیا؟ درحقیقت اس کا جواب ان افراد کے ذمے ہے' جنھوں نے یہ تنظیم قائم کی' یا جو اس کو آج چلا رہے ہیں۔ وہ اپنے سامنے اس کے لیے مستقبل کا کوئی نقشہ اور وژن رکھتے ہیں کہ یہ کہاں جائے گی' کس طرح جائے گی اور کہاں پہنچے گی؟ کیونکہ آپ نے مجھے یہاں پر بلایا ہے' اس لیے میں بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں تھوڑی سی مدد کروں گا۔

بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جو کام ہوتے چلے آ رہے ہیں' وہی کام ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر بغیر سوچے سمجھے کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم کیوں کا سوال اٹھائیں' اور کچھ ایسے سوال اٹھائیں جو سچ اور حقیقت کی خبر دیں تو اس کے اندر بعض جواب بڑے تلخ بھی ہو سکتے ہیں۔ جب بھی سچائی سامنے آئے گی یا جب بھی moment of truth سامنے آئے گا تو وہ اپنے تقاضے بھی ساتھ لائے گا۔ حق اپنے دامن میں بہت شدید تقاضے اور کڑے مطالبات لے کر آتا ہے۔ "اقراء" کا ایک لفظ اپنے اندر جو جواب لے کر آیا اور حق کی جو خبر لے کر آیا اس نے مکہ کے ایک پرامن شہری تاجر کو اس طرح مضطرب اور بے چین کر دیا' کہ وہ کانپتے ہوئے اپنے گھر آئے اور کہا خشیة علی نفسی (مجھے تو اپنی جان کا ڈر ہے)۔ یہ صرف حق کا انکشاف تھا'

جس نے بدن پر لرزہ طاری کر دیا' اور دل و جان کا خوف پیدا کر دیا۔ اس لیے جہاں بھی سچ اور حق آئے گا یا جب بھی moment of truth سامنے آئے گا تو پھر انسان کو اس کے لیے بھی تیار ہونا ہو گا کہ وہ سچائی کو قبول کرے۔ اسی لیے "کیوں" کا سوال کرنا اتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ نام تو رکھ لیا ہے' جس کے پیچھے کوئی سوچی سمجھی غرض نہیں ہے تو پھر اس کے تقاضے مختلف ہوں گے کیونکہ آدمی بے کار اور فضول کام نہیں کرتا' اس کی قوتیں' صلاحیتیں اور وقت اس لیے نہیں کہ فضول کاموں میں صرف ہو۔ اگر یہ معلوم ہو کہ نہیں' ہم نے تو بڑے جہاں فتح کرنے کے لیے اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کو قائم کیا ہے' اس کے نام کے ساتھ اسلامک کا لفظ بڑھایا ہے تو پھر اس کے تقاضوں کی ایک دنیا ہو گی۔ اس لیے کہ پھر جہاں فتح کرنے کے لیے کمر ہمت باندھنا پڑے گی' میدان میں اترنا پڑے گا' محنت کرنا پڑے گی' سعی و جہد میں مصروف ہونا پڑے گا اور اپنی جسم و جان کی قوتوں کو اس مقصد کے لیے لگانا ہو گا۔ یاد رکھیے نئی نئی خواہشات' خوابوں' تقریروں' گفتگوؤں اور اجلاسوں سے جہاں فتح نہیں ہوتے بلکہ محنت' قربانی' اپنے مقصد کی لگن' اس کے ساتھ وابستگی اور اس کے لیے ایثار سے نئے جہاں فتح ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے ہے کہ ان جہانوں کو فتح کرنے کے لیے قربانی دینا پڑتی ہے۔ صنعت اور تجارت کے میدان میں فتوحات ان صلاحیتوں کے بغیر نہیں ہوتیں۔ علم و تحقیق کی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دینا ہوں' تو ان کے لیے بھی یہ ہی مطالبات ہیں۔ اگر اخلاق اور روح کی دنیا ہو تو اس کے مطالبات بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ کوئی زمین اپنی فصل کے دانے خود چل کر کسان کی گود میں نہیں ڈال دیتی' بلکہ کسان خود نکلتا ہے' ہل کندھے پر رکھتا ہے' اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے' بیج ڈالتا ہے' اس کی نگرانی کرتا ہے' پھر کہیں جا کر فصل کاٹتا ہے۔ اس طرح سے اس کی جھولی میں زمین اپنی فصل کا پھل ڈالتی ہے۔ یہ قدرت کا وہ قانون ہے جو ہر جگہ یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ اس قانون سے کوئی مقصد' کوئی منزل' کوئی دنیا اور کوئی جہاں مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر ایک پر اسی قانون کا اطلاق ہو گا۔

اس لحاظ سے اگر آپ اس سوال کا جواب دینا چاہیں' تو میرے خیال میں ڈاکٹر اپنے کام کو تین پہلوؤں سے دیکھ سکتا ہے:

ایک اس کا علم ہے جسے علم کی دنیا میں میڈیسن یا طب جدید کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کو وہ کالج میں پڑھتا ہے' پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے دوران پڑھتا ہے اور جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ میڈیکل علوم کا مجموعہ' میڈیسن خود اپنی جگہ پر عمل کا تقاضا رکھتا ہے۔ ایک آدمی جو یہ جانتا ہو کہ پل کس طرح بنایا جائے' یہ مہارت اور یہ علم اس سے اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ پل بنانے کے لیے فوراً کھڑا ہو جائے۔ لیکن اس کے بالمقابل وہ آدمی جو یہ جانتا ہو کہ جلد' جسم' دل اور نفسیات کے امراض کا علاج کس طرح ہو

سکتا ہے' اس کا معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ علم و ہنر کی یہ سچائی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ نسخہ شفا کو لے کر جلد' جسم' ذہن اور نفسیات کے امراض میں مبتلا فرد کا علاج کرے۔ یہ صرف اخلاقی اور انسانی تقاضا نہیں ہے' بلکہ خود ڈاکٹر کے حلف کے اندر یہ بات شامل ہے کہ وہ کسی تفریق اور تردد کے بغیر آگے بڑھ کر مریض کی اعانت کرے۔

دوسری بات کو آپ میڈیسن کی پریکٹس کہتے ہیں اور تیسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اس کام کو اکیلا انجام نہیں دیتا' بلکہ اس کے ساتھ معاشرہ ہوتا ہے' اس کے ساتھ ڈاکٹروں کی برادری ہوتی ہے' جس کے ساتھ مل کر وہ عمل کرتا ہے۔ اس عمل کو سب مل کر چلاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے جب آپ نے میڈیکل ایسوسی ایشن کے ساتھ اسلامک کا لفظ لگایا' تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان تینوں پہلوؤں سے اسلامک کے لفظ کے تقاضے آخر کیا ہیں؟ یہ بات اگر آپ متعین کرلیں تو پھر معلوم ہو گا کہ اس کو کیوں بنایا گیا تھا' اور اگر بناتے وقت نہیں سوچا گیا تھا تو اب سوچا جا سکتا ہے کہ ہم نے اس کو کیوں بنایا ہوا ہے۔ اگر آج اس وقت بھی ہم یہ بات سوچنے کو تیار نہ ہوں' تو شاید مستقبل میں کوئی سوچے کہ یہ ورثہ جو ہم کو ملا ہے' ہم اس کو کیوں آگے بڑھائیں۔۔۔۔ لیکن ان تینوں پہلوؤں سے ہی غور کرنے اور سوچنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک اس مجموعہ علم کا تعلق ہے جس کو ہم میڈیسن کے نام سے پکارتے ہیں' اس کا بظاہر تو کوئی تعلق اسلام کے نام سے نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر علم کا تعلق بہت گہرائی کے ساتھ اسلام سے ہے۔ علم اگرچہ بظاہر بالکل ہی غیر جانب دار (نیوٹرل) اور بلا اقدار (value less) محسوس ہوتا ہو' لیکن اس کے باوجود ہر علم جانب دار ہوتا ہے۔ ہر ٹیکنالوجی کے اندر کچھ اقدار ہوتی ہیں۔ وہ اقدار اور وہ جانب داری اس تہذیب اور اس کلچر کا حصہ ہوتی ہے' جہاں اس نے پرورش پائی ہے۔ اگر وہ خدا پرست معاشرے میں پروان چڑھا ہو تو اس کی روح خدا پرستی کی روح ہوتی ہے' اور اس پر خدا پرستی کی چھاپ ہوتی ہے۔ اگر اس نے سیکولر' خدا سے بے نیاز' غافل اور خدا سے انکاری معاشرے کے اندر پرورش پائی ہو تو اس کی روح سیکولر ہو گی اور اس کے اوپر سیکولرازم کی چھاپ ہو گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں جو دوائیں ہم دیتے اور جو سرجری کرتے ہیں' اس کا خدا پرستی اور خدا فراموشی سے کیا تعلق ہے؟

امر واقعہ ہے کہ ٹیکنالوجی کا اقدار اور مقاصد کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میں ڈاکٹر نہیں ہوں' انجینئر ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ انجینئرنگ کا ایک معمولی سا کام بھی اپنی اقدار کے لحاظ سے معاشرے اور انسان پر بڑا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ہوائی جہازوں کا شور گھروں کا سکون برباد کر دیتا ہے۔ ایک ملک کے درمیان دوڑتی ہوئی موٹرونے گاؤں اور دیہات کو ایک دوسرے سے کاٹ کر ان کے معاشرتی تعلقات کو برباد کر دیتی ہے۔ گھر میں ٹیلی فون کی آمد تعلقات کی مٹھاس اور چاشنی کو کم کر کے انھیں غیر ذاتی نوعیت کا بنا

دیتی ہے کہ ٹیلی فون پر چند جملے بولے اور ملاقات کا حق ادا ہو گیا۔

وہ معاشرہ جہاں چچا' ماموں اور دوستوں کے ہاں جا کر باہمی تعلقات کی ایک دنیا آباد ہوا کرتی تھی' اب وہاں ٹیلی فون کا ڈائل گھمانے اور لہروں کے دوش پر آواز سن لینے سے تعلقات کا سفر بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی سہولتوں اور اچھائیوں سے مجھے انکار نہیں' لیکن اس وقت میں ٹیکنالوجی کے اس پہلو پر بات کر رہا ہوں' جو معاشرے اور اقدار پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسی طرح علم طب کا بھی معاملہ ہے۔ جہاں جدید علم طب پروان چڑھا ہے' وہاں پر یہ موضوع زیر بحث ہے کہ وہ سارے کام جو پروفیشنلز یعنی ڈاکٹروں کے سپرد کر دیے گئے ہیں' کیا واقعی ان پروفیشنلز کے حوالے ہونے چاہئیں؟ یا معاشرے کے دوسرے افراد اور اداروں کو ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اس ضمن میں بچے کی ولادت اور اس کے بعد بچے کی فیڈنگ اور اس کی سماجی دیکھ بھال کا مسئلہ ہے۔ وہ جنھوں نے اس جدید پیشے کو پروان چڑھایا' خود یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا واقعی ہم نے یہ صحیح کیا ہے کہ ایک انسانی جسم اور اس سے پیدا ہونے والی انسانی ہستی' جس کا خاندان سے گہرا تعلق ہے اور وہ اس کی نفسیات سے نہ ختم ہونے والا تعلق رکھتی ہے' کیا اس کو اجنبی ہاتھوں میں دینا کوئی درست اقدام ہے؟ مغرب کی سماجی طبی بحثوں میں یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔

آپ کے سامنے یہ حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ بھی وہی کام کریں جو دوسرے ڈاکٹر کر رہے ہیں' جس طرح وہ بتاتے ہیں کہ دل کی تکلیف کا بہتر علاج کیا ہو سکتا ہے' آپ بھی بتائیں' یہ بھی انسان کی خدمت ہو گی۔ اور مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن یہ کام میڈیکل ایسوسی ایشن بنا کر بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ "اسلامک" کا لفظ لگانے کی شاید ضرورت نہ تھی۔

اسی طرح دوسرا کام پریکٹس سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دراصل بڑا اہم کام ہے۔ میڈیسن میں پریکٹس چاہے عمومی ہو' سرجری کی ہو یا سائیکالوجی کی' اگر وہ اسلامک پریکٹس ہے تو اس کو عام پریکٹس سے مختلف ہونا چاہیے۔ اس کے اندر خدا پرستی کی روح ہونی چاہیے۔ جہاں اس پریکٹس کو' جسم کو شفا پہنچانے کا انتظام کرنا چاہیے' وہاں بندے کی روح اور اس کی نفسیات کو بھی اس کے پیدا کرنے والے خالق اور مالک سے جوڑنے کا ذریعہ بننا چاہیے۔ اس کا تیسرا پہلو ڈاکٹروں کی برادری سے متعلق ہے۔ جہاں ڈاکٹر اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر پریکٹس کرتا ہے' وہاں اسے اپنی برادری کو بھی اسی راہ پر لے کر چلنے کی کوشش کرنا ہے جو راہ "اسلامک" کا لفظ واضح کرتا ہے۔ یہ اس کا تیسرا پہلو ہے۔ ان تین پہلوؤں سے اگر آپ غور کریں' تو چند اہم باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اسی طرح وہ اس بات کی پکار

کرتا ہے کہ کلکم من آدم وآدم من تراب (تم سب آدم سے پیدا ہوئے ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے)' انسان سب کے سب ایک ہیں۔ مرد اور عورت کا فرق نظر آتا ہے مگر یہ ایک ہی نفس سے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ کوئی دو الگ الگ مخلوق نہیں ہیں اور الگ الگ نفس سے پیدا نہیں کیے گئے۔ اسی طرح اسلام اس نظریے کو بھی پیش کرتا ہے کہ انسان کا وجود بھی ایک وحدت ہے جو روح' ذہن اور جسم کا مجموعہ ہے۔ نفسیات' فلسفے اور خود میڈیسن میں ظاہر اور باطن کی بحثیں بے انتہا ہیں' لیکن ہم سب کا تجربہ ہے کہ ایک انسان کا وجود ایک اکائی ہے۔ ساری چیزوں کا اثر اس کی روح' قلب اور اخلاق پر پڑتا ہے۔ روح و اخلاق اور قلب کا اثر اس کے جسم کے اوپر پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے انسانی وجود ایک وحدت ہے۔ اگر اس کو غصہ آئے گا' نفرت کی آگ دل کے اندر بھڑکے گی تو اس کا بلڈ پریشر اونچا جا سکتا ہے اور وہ ہارٹ اٹیک کا شکار ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بیماری و کمزوری میں دل شکستہ ہو گا تو اس کی روح بھی افسردگی کا شکار ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص گالی دے گا تو اس کے جسم کے اندر بہت سارے خامرے (enzymes) تیزی سے دوڑنا شروع کر دیں گے۔ اگر اس کا دل خوشی اور فرحت کا مسکن ہو گا تو بہت سارے جسمانی امراض دور ہو جائیں۔

مسلمانوں نے قرآن مجید کی تعلیم کے لیے جہاں بڑے بڑے دارالعلوم اور علوم و فنون کی تحقیق کے لیے بڑے بڑے ادارے قائم کیے' وہاں اگر آپ اس دور میں ان کے ہسپتالوں کا حال پڑھیں تو حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ شاید عصر حاضر کے بہت سے ہسپتال بھی اس دور کے ہسپتالوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ علاج کی سہولتیں' مریضوں کی مدد کے لیے مشیر اور صلاح کار' پھر مریضوں کے گھروں پر ان کے خاندان کی خبرگیری کے لیے وظیفے اور نہ معلوم کتنے انتظامات تھے جو ان صاف' روشن اور کشادہ ہسپتالوں میں کیے جاتے تھے۔ میں آپ کے سامنے زوال پذیر قوموں کے ہسپتالوں کا ذکر نہیں کر رہا جس طرح میو ہسپتال ہے۔ بلکہ ترقی کے بام عروج پر پہنچی ہوئی قوم کے ہسپتالوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس زمانے کے بڑے شہروں قاہرہ' دمشق' بغداد وغیرہ کے علاوہ بھی ملوکیت زدہ خلافت میں ہر جگہ یہ ہسپتال کام کر رہے تھے جہاں پر یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ان کے سیاسی نظام کی خرابی کے باوجود' ان کے قلب و ذہن اور فکر و تہذیب کو متاثر کرنے والا دین اسلام انھیں یہ راستہ دکھا رہا تھا' ابھار رہا تھا اور کام لے رہا تھا۔

میڈیسن کی تعلیم کے نتیجے میں ایک نسخہ شفا آپ کے ہاتھ میں آیا ہے اور دوسرا وہ نسخہ شفا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے قَدْ جَآءَتْکُمْ جو تمھارے پاس آیا ہے' شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ یہ شفا ہے ان سارے امراض کے لیے' جو سینوں کے اندر ہیں۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (بنی اسرائیل ۱۷: ۸۲) اور ہم قرآن میں سے وہ چیز اتار رہے ہیں جو مومنین کے لیے شفا کا باعث ہے۔-- تو شفا کے یہ دو پہلو ہیں۔ جسمانی امراض کے علاج اور روحانی امراض کے علاج میں تو ہمیشہ بڑا گہرا ربط رہا ہے۔ اگر

آپ سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی کے ان واقعات کو پڑھیں' جو قرآن مجید نے بیان کیے ہیں اور بائبل نے بھی نقل کیے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف ان کے ہاتھ میں وہ شفا تھی جس سے اندھے دیکھتے تھے' بہرے سنتے تھے' گونگے بولتے تھے' مفلوج اٹھ کر چلنا شروع کرتے تھے اور مردوں کے اندر جان پڑ جاتی تھی' برص' جذام اور کوڑھ سے جلدیں صاف ہو جایا کرتی تھیں۔ دوسری طرف وہ کلمہ بھی ان کے پاس تھا' جس سے دلوں کی دنیا جاگتی تھی' انسان بدل جایا کرتے تھے' ان کے اخلاق' مقاصد' اغراض' طرز زندگی سب بدل جایا کرتے تھے۔ عیسائی مشنری میڈیسن' طب کو بہت شدت کے ساتھ اپنی دعوت اور مشن کے لیے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں' اس میں ان واقعات کا بھی عمل دخل ہے جو قرآن اور عیسائی روایات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے روایت کیے گئے ہیں۔

جب آپ ان تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھیں' انسانی وجود کو ایک وحدت تسلیم کریں اور اس ذمہ داری کو تسلیم کریں تو پھر بحیثیت ایک اسلامک' میڈیکل ڈاکٹر کے' آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ ان پہلوؤں سے مریض کے لیے شفا کی فکر کریں۔ جتنی فکر' طلب اور تڑپ آپ کو اس بات کی ہو کہ مریض اچھا ہو جائے' یہاں پر میں کوئی بدگمانی نہیں کرتا' جتنی طلب آپ کو اس بات کی ہو کہ آپ کے ہاتھ میں فیس آ جائے' اس سے بدرجہا زیادہ طلب اور تڑپ آپ کو اس بات کی بھی ہونا چاہیے کہ مریض اندر سے شفا پا جائے اور آپ کے ہاتھ میں وہ فیس آ جائے' جس فیس کا اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کو ہدایت کے راستے پر لانے کی صورت میں' آخرت میں دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے' جو سات سو گنا' بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ گنا پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ دراصل یہ وہ چیز ہے جو اسلامک میڈیکل کے حوالے سے آپ کے سامنے واضح اور صاف ہونا چاہیے۔ اس میں بحیثیت اسلامک میڈیکل' ڈاکٹر آپ کا حسن سلوک کلیدی مقام رکھتا ہے۔ جس ڈاکٹر کو اسلام پر ایمان لانے کا دعویٰ ہو' مریض دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ یہ تو فرشتہ ہے' ڈاکٹر نہیں ہے۔ اس وقت آپ اسلامک کی بات کو تھوڑی دیر کے لیے نظرانداز کر دیجیے۔ ذرا سوچیے آخر کیا بات ہے کہ وہ مسلمان ڈاکٹر جو امریکہ اور انگلینڈ میں یہ دیکھ کر آتے ہیں کہ مریضوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے' (جن کا خود میں نے ہفتوں' مہینوں' سالوں رہ کر مشاہدہ کیا ہے) کس طرح انسان کی خدمت کی جاتی ہے' کس طرح انسان کے ساتھ نرمی سے بولا جاتا ہے' کس طرح انسان کی دیکھ بھال ہوتی ہے' لیکن جب وہی ڈاکٹر اپنے اس ماحول اور کلچر میں آتے ہیں تو وہ کیوں بدل جاتے ہیں؟ ان کا رویہ کیوں جارحانہ تغافل' بے نیازی اور سختی کا ہو جاتا ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال کی مثالیں کسی بھی ہسپتال میں جا کر دیکھی جا سکتی ہیں۔ وہ ڈاکٹر' جس کی ساری تعلیم و تربیت مغربی کلچر میں ہوئی' وہیں پروان چڑھا' اس کی کیا وجہ ہے کہ چند مہینوں میں وہ یہاں آکر ان تمام مثبت رویوں کو بھول جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اکیلا فرد کلچر کے بہاؤ کے آگے بے بس ہو

جاتا ہے۔

میں نے پہلے بھی اپنے اس مشاہدے کو بیان کیا ہے کہ مجھے کئی بار لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈے سے کراچی کے ہوائی اڈے تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ انسان جو ہیتھرو ہوائی اڈے پر بڑے مہذب انداز میں قطار باندھ کر کھڑا ہوتا ہے، وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ چھلانگ لگا کر آگے بڑھ جائے یا کسی کی مٹھی گرم کر کے کوئی کام کروا لے، لیکن جب وہی انسان بارہ گھنٹے کے بعد کراچی ہوائی اڈے پر اترتا ہے تو اس کی ماہیت تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ اب وہ "کیو" کو نظرانداز کر کے آگے بڑھتا ہے، سفارشی تلاش کرتا ہے اور مٹھی گرم کر کے کام نکالتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ: تعلیم عام ہو جائے گی تو ان امراض کا علاج ہو جائے گا، میں کہتا ہوں کہ وہ تو بڑا تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ وہاں سے پڑھ لکھ کر آتا ہے، اور سماجی شائستگی کی سب مثالیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ مگر پھر وہ کیا چیز ہے جو اس کو بدل دیتی ہے۔ کیا بارہ گھنٹے کے ہوائی جہاز کے سفر میں کوئی جادو کی چھڑی اس پر پھیر دی جاتی ہے یا کوئی طلسم باندھ دیا جاتا ہے۔ آخر کیا چیز اس کو بدل دیتی ہے؟ اس چیز کو بدلنے کا محرک دونوں ہوائی اڈوں کے ساتھ بسنے والی اقوام کے مروج کلچر ہیں۔ لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈے پر وہ اسی کلچر کے رخ پر بہنے کے لیے مجبور ہے، جو وہاں بہہ رہا ہے اور کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کا کلچر بالکل مختلف ہے۔ اب واپس آ کر وہ نہ چاہتا ہو، پھر بھی مجبوراً وہ اسی رخ پر بہنا شروع کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر برادری اور پورے معاشرے کے حوالے سے، اپنی قوتیں اس کلچر اور معاشرے کے نظام، اغراض اور اقدار کو بدلنے کے لیے لگا دے، جس سے ان تمام امراض کا علاج ہو گا۔ ایک شخص پہاڑی کے چراغ کی طرح معاشرے کی گندگی سے اوپر اٹھ کر اپنی روشنی پھیلا سکتا ہے، لیکن عام انسان کے بس میں یہ بات نہیں ہوتی، وہ مجبور ہوتا ہے کہ معاشرے، کلچر اور تہذیب کے قدم بہ قدم اور نقش بہ نقش چلے اور اس کی رو میں بہے اور اسی کے پیچھے جائے۔ وہ انھی اغراض و مقاصد کی پیروی کرے، انھی کی جستجو کرے، جو اغراض و مقاصد اس معاشرے، تہذیب اور کلچر کے اندر محبوب و مطلوب ہوں اور پسند کیے جاتے ہوں، یا جن کی تعریف ہوتی ہو، جن پر شہرت ملتی ہو اور جن پر معاشرے کے اندر مقام ملتا ہو۔ یہاں پر ان کے اچھا اور برا ہونے کی بحث نہیں ہے، بس بہاؤ کے رخ پر بہے جانا ہے۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی اس طرح کیا ہے، اور اس بات کو لازم کیا ہے کہ انسان صرف خود نہ بدلے بلکہ اپنے معاشرے کو بھی بدلے کیونکہ معاشرے کو بدلے بغیر نہ وہ لہر پیدا ہو سکتی اور نہ وہ رو بہہ سکتی ہے، جس میں عام انسان بھلے اور سیدھے راستے پر چل سکتا ہے۔

جیسا کہ اپنی گفتگو کے ابتدائی حصے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ جو شخص آپ کے پاس آتا ہے، وہ

دراصل مجبور، بے کس، بے بس، لاچار اور درد و الم کے اندر گرفتار ہوتا ہے۔ وہ آپ کے پاس آتا ہے تو، اچھی بات سننے، قبول کرنے اور اپنے حال کو بہتر بنانے کے لیے آتا ہے۔ اب اگر آپ اس کو صرف ایک ہی نسخہ شفا پہنچاتے ہیں، اور اگر آپ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ آپ کی جیب میں فیس آجائے، مگر آپ کی نظر اس دوسرے نسخہ شفا پر نہیں ہے جو آپ کے طاق میں، آپ کے سرہانے، اور آپ کی کتابوں کے اوپر رکھا ہوا ہے اور پھر آپ کی نظر اس فیس پر نہیں ہے کہ جس کا وعدہ رب العالمین نے کیا ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو میڈیکل کے ساتھ لفظ "اسلامک" لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے ساتھ وابستہ ڈاکٹروں کو اس بات کی تعلیم و تربیت نہیں دے سکتے کہ وہ اس فیس پر بھی نگاہ رکھیں اور اس نسخہ شفا کو بھی پھیلائیں، تو پھر آپ کی اس ایسوسی ایشن کے وجود کا میری نظر میں کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے کہ میڈیسن میں علم و تحقیق اور علاج معالجہ سے وابستہ ڈاکٹروں کی دیگر تنظیمیں ہی بہت کافی ہیں، ان کی موجودگی میں ایک اور تنظیم کو آخر کیوں کھڑا کیا جائے۔ سرجری، ادویات، ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کے اوپر اربوں کروڑوں ڈالر اور اسٹرلنگ دنیا بھر میں خرچ ہو رہے ہیں، اس خالص پیشہ ورانہ عمل میں اگر آپ نے بھی تھوڑا سا اضافہ کر بھی دیا، تو کون سا تیر مار لیں گے؟--- لیکن میرے عزیزو، آپ کے پاس کرنے کا وہ کام ہے، جو بلین ڈالرز کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتا اور اگر آپ نے اس لحاظ سے میڈیسن کے علم کو، میڈیسن کی پریکٹس کو اور میڈیسن کی کمیونٹی کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا، تو پھر یہ وہ راستہ اور وہ شاہراہ ہوگی، جو اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کا میڈیسن کے میدان میں منفرد کارنامہ اور لاجواب ثمر ہوگا۔

یہ کام کرنے کے لیے، سب سے پہلے آپ کو اپنی ذات کی طرف توجہ دینا ہوگی، اس لیے کہ اپنی ذات پر توجہ دیے بغیر، آپ وہ کام نہیں کر سکتے جس کی طرف اس گفتگو میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے پاس جیل میں دو قیدی اگر صرف یہ پوچھنے کے لیے پہنچتے ہیں کہ "ہمارے خواب کی تعبیر کیا ہے؟" تو وہ خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے ان کو یہ دعوت بھی دیتے ہیں: ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف ۱۲: ۳۹) مطلب یہ کہ بہت سارے مالک و آقا اور رب بہتر ہیں، یا یہ کہ انسان ایک ہی آقا کا غلام ہو، اور ایک ہی آقا کی غلامی اختیار کر کے اس کے پیچھے چلے۔ آپ کے پاس آنے والا ہر مریض اگر آپ کے اندر یہ کسک اور بے چینی پیدا نہیں کرتا، کہ آپ اس کو بھی نسخہ شفا پہنچائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اپنی ذات پر توجہ دینی چاہیے۔ یہ کام عبائیں زیب تن کر کے اور لبادے اوڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ ہرچند کہ آپ اپنے جسم کی آرائش، واسکٹ، شیروانی اور سوٹ پہن کر، کر سکتے ہیں، لیکن روح اور دل کی آرائش و زیبائش باہر سے نہیں اوڑھی جا سکتی۔ اس کو اندر سے ہی پیدا ہونا پڑتا ہے۔ اگر انسان کے اندر وہ جذبہ موجزن ہو جائے، جو اس کام کے لیے ضروری ہے تو پھر ہم کسی کے کہے بغیر اپنا کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ جس

طرح ہم میڈیکل پریکٹس کو اپنا کام سمجھ کر کلینک پر جاتے اور توجہ دیتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کی فکر کرتے ہیں، اس کام کے لیے کسی وعظ، کسی درس، کسی تنظیم اور کسی دستور کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، کیونکہ بقائی ہوش و حواس ان تقاضوں اور مطالبات کی ضرورت کا احساس ہمارے دل کے اندر موجود ہوتا ہے، ان کا جذبہ ہمارے دلوں کے اندر موجزن ہوتا ہے۔ پھر یہ کام بغیر کسی کے کہے سنے ہم خود سے کرتے ہیں۔ ہم اسیتھس کوپ لگا کر دوسروں کے دلوں کی دھڑکنیں تو سن لیتے ہیں مگر کبھی اپنے دل کی دھڑکنوں کو بھی سننے کی کوشش کریں۔ اپنے دل و دماغ کی دنیا میں پروان چڑھنے والی خواہشات، امنگوں اور جذبوں کو بھی دیکھیں کہ داخلی دنیا میں کیا کچھ موجود ہے اور اس کا علاج کس طرح ہو سکتا ہے۔

ان داخلی عارضوں کو خود دیکھنے کا جذبہ اسی وقت موجزن ہو سکتا ہے، جب آپ اس بات کا فیصلہ کر لیں، کہ دل کا قبلہ صرف ایک ہو گا۔ جس طرح نماز کا قبلہ صرف ایک ہے اور وہ خانہ کعبہ ہے، اس سے ہٹ کر اور دوسری طرف منہ کر کے نماز نہیں ہو سکتی، اسی طرح زندگی اور دل کا قبلہ بھی صرف ایک ہو گا، تو حق بندگی ادا ہو گا اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی محبت کا قبلہ ہو گا۔ اس سے ہٹ کر اگر زندگی کا رخ بدل گیا اور توجہات دوسری طرف چلی گئیں تو پھر ایسی زندگی بالکل اسی طرح فاسد ہو جائے گی جس طرح خانہ کعبہ کی طرف منہ کیے بغیر پڑھی جانے والی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر آپ زندگی کو یک سو اور یک رخ کر لیں، اسے ایک ہی ہدف پر مرکوز کر لیں تو اس سے آپ کی ذات کی تشکیل ہو گی۔

اپنے دست شفا کی طرف لپکنے والے مریضوں کو اگر آپ نے حقیقی نسخہ شفا اور اس کا پیغام پہنچا دیا، تو وہ نہ صرف اس سے استفادہ کریں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ یہ نسخہ شفا انھیں اور خود آپ کو ایک نئے رخ پر ڈال دے گا۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس کے بعد ان مریضوں کو جسمانی طور پر بھی بڑا گہرا فائدہ ہو گا۔ اگرچہ اسے کوئے کری (quakery) کہا گیا ہے لیکن میں نے اس پر پوری ایک فلم سیریز دیکھی ہے اور ایک کتاب بھی پڑھی ہے، کہ یہاں کینسر کا علاج ایک کلینک میں صرف اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ انسان اپنے لائف اسٹائل یا طرز زندگی کو بدل دے، اور اس بات پر یقین رکھے کہ اس کا علاج ہو جائے گا۔ وہ کیمیائی غیر نامیاتی (in organic) چیزوں کو چھوڑ دے، نامیاتی (organic) چیزوں پہ بھروسہ رکھے، صاف ستھرے ماحول میں رہے، اور کوئی دوا نہ کھائے۔ اس طرز علاج کو اختیار کرنے کے استنادی شواہد (documented evidence) موجود ہیں کہ اس طریقے کے تمام مریضوں کو نہیں، مگر کچھ کو ضرور فائدہ ہوا ہے۔ جہاں پر امید کا مرجع اور مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہو اور آپ مریض کے اندر یہ امید پیدا کر دیں کہ: واذا مرضت فھو یشفین جب میں بیمار ہوتا ہوں، تو وہ شفا دیتا ہے۔ آپ مریض کا تعلق نسخہ شفا اور صاحب نسخہ شفا سے جوڑ کر اس کی زندگی کو یکسو کر دیں، تو، آپ میں سے جو بھی سائیکلوجی اور دوسرے علوم کے ماہر ہیں وہ خوب

جانتے ہیں کہ اس کے کتنے گہرے اثرات' اس کے جسم پر' اس کی نفسیات' اور اس کی زندگی پر بھی پڑیں گے' خود اس کے خاندان اور آخرکار پورے معاشرے پر بھی اثرات پڑیں گے۔ دراصل آپ کی ذات اور اس کام کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر آپ نے اپنی ذات کو بنایا' اس کی تراش خراش کی اور آپ اپنے دل کی دھڑکن سننے کے قابل ہو گئے' تو پھر آپ یہ کام کر سکیں گے۔

اس پوری طبعی کائنات کے اندر یہ اصول کارفرما ہے کہ یہ ایک قانون پر قائم ہے۔ آپ کی نگاہ کچھ طبعی قوانین کی پابند ہے اور انھی کے تحت دیکھتی ہے۔ وہ اربوں' کھربوں' نوری سال کے فاصلوں پر' خلا میں تیرتے ہوئے ستاروں کو بھی دیکھ سکتی ہے اس لیے کہ یہ پورا عالم اور کائنات ایک طبعی عالم اور طبعی کائنات ہے' جو ایک قانون پر قائم ہے۔ اس لیے اس فانی انسان کی یہ چھوٹی سی نگاہ اس بات پر قادر ہے کہ اربوں' کھربوں نوری سال کے فاصلوں پر سیاروں تک پہنچ کر انھیں دیکھ لے' لیکن روح اور دل کی دنیا بالکل دوسری ہے۔ یہ آنکھ اور کان یہاں پر بھی دیکھنا سننا چاہیں تو معلوم کر سکتے ہیں کہ دل کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اگر آپ دوسروں کے دل کی دھڑکن سن سکتے ہوں' عارضہ قلب کا علاج کر سکتے ہوں' چیر پھاڑ کر کے امراض کو دور کر سکتے ہوں' تو آپ کو تھوڑا سا اپنے اندر بھی جھانک کر' اپنے دل کی دھڑکن سن کر اس دل کو صحیح راہ پر لگانے کی فکر کرنا ہو گی۔ اس سے آپ کے پورے وجود اور ذات کی وحدت صحیح راہ پر آئے گی۔ اس سے آپ کی اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن وہ کام کرے گی' جو کام اسے کرنا چاہیے' اور جسے کیے بغیر اس کے قیام کا کوئی جواز نہیں۔ اسی کے نتیجے میں معاشرے پر اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔

اگر ان گزارشات کو آپ سامنے رکھیں' تو شاید ان سے آپ کو اس "کیوں" کا جواب دینے میں کچھ مدد مل سکے۔ (تدوین : سلیم منصور خالد)

ری پرنٹ دستیاب ہیں۔ منشورات' منصورہ' لاہور

ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے'

جو دنیا کو راہ راست پر لانے اور

مسلک حق کی دعوت دینے کے لیے اٹھا ہو'

درشت مزاجی' ترش روئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔

اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے

مگر اس مقصد کو الٹا نقصان پہنچتا ہے

جس کے لیے وہ اٹھا ہے۔

(تفہیم القرآن' جلد اول' ص ۳۷۸)

(خیر خواہ)

روشنی کی کرن
قبول اسلام کی ایک داستان

جارج اشقون

ترجمہ: نذر الحفیظ ندوی

مغرب اور اسلام کی کش مکش کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ خدا سے بغاوت پر مبنی تہذیب سے دل برداشتہ ہو کر متلاشیان حق مسلسل امت مسلمہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ سابق امریکی صدر، جارج واشنگٹن کے پڑپوتے، جارج اشقون کی یہ کہانی الدعوۃ ریاض، ربیع الاول ۱۴۱۸ھ سے تعمیر حیات لکھنؤ میں ترجمہ کی گئی۔ یہ ریاض ریڈیو کے شعبہ انگریزی کے لیے ایک انٹرویو تھا۔ ہم شکریے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

میری پیدائش واشنگٹن کے قریب ورجینیا میں ہوئی۔ میرے والد امریکی بحریہ میں ایک افسر تھے۔ وہ امریکی صدر جارج واشنگٹن کے پوتے تھے۔ میری نشوونما اور تعلیم و تربیت کے سارے مراحل خاندان ہی میں طے ہوئے۔ میرے آباد اجداد کا ایک بڑا فارم ہے جو چار سو سال سے ہماری ملکیت ہے۔

عیسائیت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی جستجو میرے اندر بچپن ہی سے تھی۔ میں جس پادری سے بھی سوالات کرتا، وہ مجھے مطمئن کرنے میں ناکام ہو جاتا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور حضرت عیسیٰؑ کا وجود دونوں الگ الگ ہیں۔ یہ دور میری زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔

جب میں نے صحافتی زندگی میں قدم رکھا تو ایک کیمرہ مین کی حیثیت سے رسالہ ٹائم کی طرف سے لبنان کی خانہ جنگی کی تصویریں کھینچنے کے لیے بیروت جانا پڑا۔ ایک عرب اور مسلمان ملک کے سفر کا تصور کر کے مجھے خوف اور گھبراہٹ ہو رہی تھی، اس لیے کہ امریکی فلموں اور میڈیا نے میرے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ مسلمان تشدد پسند اور ظالم ہوتے ہیں، وہ انتہائی جاہل اور جنگلی ہوتے ہیں، انسانی

تہذیب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن لبنان میں داخل ہوتے ہی میرے تمام نظریات و تصورات یکسر باطل ثابت ہوئے۔ میں نے بچشم خود مشاہدہ اور تجربہ کیا کہ مسلمانوں اور عربوں سے متعلق مغربی میڈیا نے جو کچھ تصورات دیے ہیں، وہ جھوٹ اور گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔ لبنان میں جن مسلمانوں سے مختلف مقامات پر ملاقاتیں ہوئیں، انھوں نے ہمیں خطرات سے محفوظ رکھنے میں جان کی بازی لگا دی۔ میرے کھانے پینے اور آرام و راحت کے تمام وسائل مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب (عیسائی فوجوں) کی کمین گاہوں سے مجھ پر گولی چلائی گئی اور میں زخموں سے چور ہو گیا تو ان مسلمانوں نے میرے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور انھوں نے اس طرح میری دیکھ بھال کی جیسے میں ان کا بھائی اور فرد خاندان ہوں۔ اس وقت میری عمر صرف بیس سال تھی۔ جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہیں قریب میں ایک مسجد تھی، جس کے امام سے میں ملاقاتیں کرتا اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا۔ ان کی باتوں سے میرے اندر اسلام سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ اس وقت میں نے نہ قرآن پڑھا تھا اور نہ ہی حدیث سے واقف تھا، لیکن مسلمانوں سے گفتگو اور مسلسل ملاقاتوں اور ان کے قرب نے میری تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ میں ان مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے محاذ پر جاتا تھا تاکہ تصویریں لے سکوں۔ پھر میں واپس امریکہ آگیا۔ میں نے از سرنو مسیحی عقائد اور مختلف عیسائی فرقوں سے متعلق مطالعہ کرنا شروع کیا، گرجا گھروں میں پادریوں سے بھی ملا لیکن مجھے تشفی نہ ہو سکی۔

جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو واشنگٹن میں افغانستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک کمیٹی نے مجھے رپورٹنگ کے لیے افغانستان بھیجا۔ میری یہ بھی ذمہ داری تھی کہ افغان مجاہدین کی ضروریات کا جائزہ لوں اور مالی و فوجی امداد کا اندازہ کروں۔ ہم نے بعض افغان مجاہدین کو واشنگٹن اور نیویارک مدعو کیا تاکہ وہ امریکن کانگریس کے ارکان سے تبادلہ خیال کر سکیں۔ ان رابطوں کے دوران میں نے عام افغان مجاہدین کے اندر جو اسلامی روح پائی، اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عین معرکہ جنگ میں وقت آنے پر نمازوں کے لیے کھڑے ہو جاتے، وہ کہا کرتے کہ اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کے لیے ہم یہ عبادت کرتے ہیں۔ میں جب انھیں جوش و جذبے سے جہاد کرتے دیکھتا اور نہتے ہوتے ہوئے بھی ایک بڑی فوجی طاقت سے لڑتے دیکھتا تو اپنے دل میں کہتا کہ یہ لوگ کمزور اور نہتے ہونے کے باوجود اپنے طاقتور دشمن پر یقیناً فتح و غلبہ حاصل کرلیں گے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں وہ ایمان موجزن ہے جس سے روسی فوج محروم ہے۔

میں نے قیام افغانستان کے دوران ہی احادیث نبویؐ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقا سے فرماتے تھے کہ وہ ایمان ہی کی بدولت کامیاب و کامران ہوں

گے۔ اس میں شک نہیں کہ ایمان کی قوت سے بھرپور افغان مجاہدین جدید ترین جنگی سازوسامان سے لیس روسی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

افغانستان سے واپسی کے بعد میں صحافت کے بجائے اپنے اصل پیشہ' کیمرہ مین کا کام کرنے لگا۔ ۱۹۸۸ میں' نیویارک میں' ہم نے دوستوں کے تعاون سے ایک کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ "راک اینڈ رول" گانے والوں کی ایک ٹیم ہم نے تشکیل دی۔ یہاں سے ہماری دوسری زندگی شروع ہوئی جو سراسر لہو و لعب اور رقص و سرود اور شراب و شباب کی زندگی تھی۔ ہماری ملاقاتیں ان مشہور فلمی ستاروں سے بھی ہوئیں جن کے بارے میں ہم اخبارات میں پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہم نے دولت اکٹھی کرنی شروع کی۔ ایک سال کے اندر ہی میرے پاس ستر ہزار ڈالر جمع ہو گئے۔ میری زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی رقم میرے ہاتھ میں آئی۔

مجھے ایک بڑے دولت مند کی شادی کی تقریب میں ناروے مدعو کیا گیا تاکہ اس کی فلم بندی کروں' اس میں اچھے خاصے پیسے ملے۔ ۱۹۹۲ میں مجھے راک اینڈ رول کے مشہور مغنی' التن جان کے ساتھ سفر میں جانا پڑا تاکہ اس کے اس سفر کو کیمرے میں محفوظ کروں۔ یورپ کی سیاحت کے دوران وائنا میں ہماری ملاقات پناہ گزینوں کے ذمہ داران' اقوام متحدہ کے ایک عہدیدار سے ہوئی۔ اس نے خواہش ظاہر کی: آپ صرف دو دن کے لیے بوسنیا ہو کر آیئے اور وہاں کی خانہ جنگی کی بھی تصویریں لے لیجیے۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ میں نے خانہ جنگی کی اتنی تصویریں اتاری ہیں جو بہت سی جنگوں کے لیے کافی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ارٹیریا' ایتھوپیا' پولیساریو (مراکش)' افغانستان اور بیروت وغیرہ کی تصویریں لے چکا ہوں۔ لیکن جب میں اپنے ہوٹل میں واپس آیا تو اس شب ٹیلی ویژن پر بوسنیا کی خبریں دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ ہم نے ٹی وی پر دیکھا کہ سرائیوو میں خواتین اور معصوم بچوں نے روٹی حاصل کرنے کے لیے جو لائن لگائی تھی' اس پر سربوں نے زبردست گولہ باری کی۔ اس خبر نے میرے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا' اس لیے کہ افغانستان اور دوسرے مقامات پر بے گناہ بچے اور عورتیں جنگ میں قتل ہوئے لیکن اصل مقابلہ مردوں کا مردوں سے تھا۔ لیکن بوسنیا میں جو جنگ ہو رہی تھی وہ تو مکمل طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی۔ ہر اس چیز کو چن چن کر نشانہ بنایا جا رہا تھا جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ یہ جنگ سراسر ایک بھیانک نسلی جنگ تھی۔ دوسرے دن میں اقوام متحدہ کے دفتر میں کام کرنے والے اس دوست کے پاس دوبارہ پہنچا تاکہ سرائیوو جانے کا پروگرام ترتیب دیا جائے۔ ہم نے جب اس کی اطلاع رسالہ ٹائم کے صدر دفتر کو دی تو ذمہ داروں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے بجائے آپ دو ہفتے وہاں رہیں۔ لیکن میں نے کہا کہ میں صرف دو دن ہی اس کے لیے نکال سکتا ہوں' تاکہ اپنی کمپنی کے ضروری کام انجام دینے کے لیے نیویارک واپس جا سکوں۔

سرائیوو پہنچنے کے دوسرے ہی دن ہم نے بوسنیا کی شاہراہوں پر بڑے ہولناک مناظر دیکھے۔ فرانسیسی بکتربند گاڑی میں بیٹھ کر میں ایئرپورٹ کے راستے میں واقع ہسپتال گیا تاکہ وہاں کے مناظر کو کیمرے میں محفوظ کر سکوں۔ ہسپتال پہنچا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ سرب فوجی ہسپتال پر زبردست گولہ باری کر رہے ہیں۔ ہسپتال سے باہر ایک زخمی کو ہم نے فوراً اندر پہنچایا۔ فرانسیسی محافظ دستے تو واپس چلے گئے' ہم وہیں ہسپتال میں ٹھہر گئے اور تقریباً سولہ گھنٹے ان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ ہم نے گزارے جو کھانے پینے سے بے پروا ہو کر شب و روز انتہائی تندہی اور توجہ و محنت سے مریضوں کے علاج میں مشغول تھے۔ انھیں آپریشن کے لیے ضروری اور بنیادی سامان نہیں مل رہے تھے۔ ان کے پاس انجکشن اور دوائیں نہیں تھیں' آکسیجن کی شدید کمی تھی' پانی اور بجلی سے بھی یہ ہسپتال محروم تھا' بجلی کے بجائے موم بتی سے کام لیا جا رہا تھا' بے ہوش کرنے والی دوا تک نہیں تھی۔ ہسپتال میں آپریشن کے وسائل اور جدید ترین مشینیں موجود تھیں لیکن بجلی نہ ہونے سے سب بیکار تھیں۔ دوسری طرف سرب فوجیوں کی مسلسل گولہ باری نے سارا نظام درہم برہم کر رکھا تھا۔ آکسیجن کے سلنڈر خالی رکھے ہوئے تھے۔ چار مہینے سے یہ صورت حال تھی۔ ہم نے اقوام متحدہ کے دفتر میں فون کر کے دریافت کیا کہ کیا آکسیجن کا انتظام ہو سکتا ہے؟ کیا ہسپتال میں مریضوں کو غذائی اشیا مہیا کی جا سکتی ہیں؟ لیکن اقوام متحدہ کے افسران نے یہ عذر کیا کہ اگر ہم کسی ٹرک کے ذریعے یہ سامان پہنچانے کی کوشش بھی کریں گے تو سرب فوجیں اپنی گولہ باری سے اس کو ناکام بنا دیں گی۔ ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے' اس لیے کہ ہمارے پاس صرف تیرہ ٹرک ہیں جن پر غذائی اشیا لدی ہوئی ہیں۔ ہم کسی ایک ٹرک سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم نے وہاں موجود بوسنیا کے مسلمان فوجیوں سے ایک ٹرک حاصل کیا اور ان کے تعاون سے ٹرک کو سفید رنگ سے رنگ دیا اور اس کے ہر طرف اقوام متحدہ کا مونوگرام بنا دیا۔ ہم نے ہسپتال کو درکار اشیا کی فہرست بنائی۔ پھر اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر سے غذائی اور طبی سازوسامان لیا اور خود ڈرائیور بن کر ٹرک سے ایئرپورٹ کے راستے سربوں کی چوکیوں سے گزرتے ہوئے ہسپتال پہنچ گئے۔ سربوں نے ہم سے تعرض نہیں کیا۔ دوسرے دن اقوام متحدہ کے دفتر کو حیرت اور تعجب ہو رہا تھا کہ میرے پاس تو کاغذات ایک صحافی کے تھے اور میں اقوام متحدہ کا ڈرائیور کیسے بن گیا۔ سربوں کی وحشیانہ گولہ باری سے بچ کر صحیح سلامت ہسپتال تک پہنچنا ایک معجزہ ہی تھا۔ اگر ہم اپنے کو غیر ملکی صحافی بتا دیتے تو سرب ہمیں یقیناً گولیوں سے اڑا دیتے' اس لیے کہ بیسویں صدی کی جو خانہ جنگیاں ہوئی ہیں' ان میں سب سے زیادہ صحافی سربوں کی گولیوں سے ہی مارے گئے ہیں۔

مجھے محسوس ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خاص مقصد سے بھیجا ہے۔ میں نے تین دن کے بجائے مزید تین ہفتے یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے قیام کا تیسرا اور آخری ہفتہ تھا۔ مجھے ضروری

تصویریں اتارنی تھیں کہ اچانک ایک کمین گاہ سے مجھ پر گولیاں چلائی گئیں جو میرے ایک باز اور ٹانگ میں لگیں۔ بوسنیا کے مسلمان ڈاکٹروں نے فوری طبی امداد پہنچائی۔ اس کے بعد مکمل علاج کے لیے میں میونخ (جرمنی) چلا گیا جہاں امریکی ہسپتال میں ڈیڑھ دو مہینے علاج کی غرض سے مقیم رہا۔ ڈاکٹروں نے زخم دیکھ کر بتایا کہ اگر دو سال تک اچھی طرح علاج ہو تو آپ چل پھر سکتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کی ہدایات کو نظرانداز کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے بوسنیا میں اپنی جدوجہد جاری رکھنا ہے۔ چنانچہ میں نے پلاسٹک کے تھیلوں سے اپنے پاؤں کو لپیٹ لیا' اور پھر ہسپتال پہنچ گیا۔ ایک مہینے کے اندر میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ جرمنی ہی میں ہم نے بوسنیا کے لیے دوائیں جمع کرنے کی مہم شروع کر دی۔ جب ضروری دواؤں کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو گئی تو میں بوسنیا واپس چلا گیا۔ یہاں مجھے ایک ایسے عجیب و غریب تجربے سے گزرنا پڑا جس سے مجھے بہت غیر معمولی نفسیاتی صدمہ پہنچا۔ اس واقعے نے میری زندگی کا رخ یکسر بدل کر رکھ دیا۔

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ بوسنیا کا ایک چھوٹا سا شہر سرب فوجوں کے محاصرے میں ہے۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ کروٹ اور بوسنیا کی فوجوں نے میرے اس فیصلے کی مخالفت کی اور متنبہ کیا کہ آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ ہر طرف سربی فوج گھات لگائے بیٹھی ہے۔ یقیناً وہ ہم کو گولیوں سے بھون دیں گے۔ آپ یہ سفر نہ کریں تو بہتر ہے۔ یہ سفر خودکشی کے مترادف ہے۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا۔ ہم رات کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ جب اچھی طرح تاریکی چھا گئی تو ہم نے سفر کا آغاز کر دیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ سرب فوجیوں نے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں بال بال بچا لیا' ہم جس موٹر میں سوار تھے' وہ بری طرح تباہ و برباد ہو گئی۔ انجن' ٹائر اور شیشے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ ہم واپس آ گئے' دوسری موٹر لی اور ایک دوسرے راستے کا انتخاب کیا' جہاں سے منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا تھا۔ وحشت ناک جنگ کے اس جنہم میں ہم نے چار خواتین کو دیکھا جو ایک دوسرے کو سہارا دے کر چل رہی تھیں۔ سربوں نے پھر ہم پر گولیاں چلائیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ خواتین اپنے جسموں کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یقیناً یہ مسلمان خواتین ہیں۔ سرب فوجی مسلمانوں کا بھیس بدل کر مسلمان خواتین اور مردوں کو دھوکہ دیا کرتے اور ان کو قتل کر دیتے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے شک ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خواتین سربوں سے تعلق رکھتی ہوں اور ہم مدد کے لیے پہنچیں تو سربوں کی گولیوں کا شکار ہو جائیں۔ ہم نے یہ بات حیرت کے ساتھ نوٹ کی کہ ان خواتین میں سے ایک کے جسم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں موٹر سے اترا اور میرے ساتھ ڈرائیور بھی اتر گیا۔ یہ خواتین شدت تکلیف سے بری طرح چیخ رہی تھیں اور زار و قطار رو رہی تھیں۔ ہم جب ان خواتین کے قریب آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں ایک بچی بارہ سال کی اور دوسری تیرہ سال کی ہے۔ ایک لڑکی کے جسم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس بچی کو

اپنی موٹر میں سوار کر لیا۔ خاتون، جس کی بچی کے جسم سے خون بہہ رہا تھا، بڑی مضطرب تھی۔ ڈرائیور نے اس کو بتایا کہ یہ ڈاکٹر ہیں۔ میں نے اس بچی کو فوری طبی امداد وہیں پہنچانے کا فیصلہ کیا، اس لیے کہ اس کی حالت بہت سنگین ہو رہی تھی۔ مجھے "ابتدائی طبی امداد" کی تربیت مل چکی تھی جو اس موقع پر کام آئی۔

میں نے جب اس بچی کو دیکھا تو مجھے گہرا صدمہ پہنچا۔ میں یہ ناقابل فراموش واقعہ زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ اس بچی کی ماں نے مجھے بتایا کہ سرب فوجیوں نے اس کے ساتھ بڑی درندگی کا معاملہ کیا۔ اس کے بعد سے یہ بچی بے ہوش ہے اور قریب المرگ ہے، نبض بھی کمزور تھی۔ بچی کی ماں نے روتے ہوئے بتایا کہ سربوں نے ان کی مسلمان بستی پر حملہ کیا۔ تمام مردوں اور بچوں کو انھوں نے ان کے رشتے داروں کے سامنے ایک ایک کر کے قتل کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر ان درندوں نے بستی کی خواتین اور بچیوں کی عصمت دری کی۔ پچاس سے زائد سرب فوجیوں نے ہمارے سامنے اس بچی کی عصمت دری کی۔ اس کے باوجود بھی ان کی تسکین نہیں ہوئی تو بچی کو اپنے ساتھ لے گئے اور کئی دن کے بعد اس حال میں واپس کیا۔ پھر ان درندوں نے متعدد بار ان دونوں بچیوں کی ماؤں کی عصمت دری کی۔ آخر کار ہم لوگوں نے رات کے اندھیرے میں اس گاؤں سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بچیاں شدید تکلیف سے دوچار تھیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح ان کو اٹھا کر ہم لوگ اس گاؤں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ہولناک واقعہ سن کر میں برداشت نہ کر سکا، رونے لگا۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا، میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میں اس طرح رونے لگا جیسے میری بچی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ میں بتا نہیں سکتا کہ مجھ پر کیا گزری۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان انسانوں کو بچانے کی خاطر مجھے اپنی زندگی یکسر تبدیل کر دینا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ یہ مسلمان ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ انسان ہیں۔ بچپن میں مجھے انسانوں سے محبت کرنا سکھایا گیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ رہ کر بھی ہم نے یہی سیکھا تھا، خاص طور سے بوسنیا کے قیام کے دوران اس کا مشاہدہ زیادہ ہوا۔ میں نے اس بچی کو بوسنیا کے اس ہسپتال میں داخل کروا دیا جو خواتین کے لیے تھا۔ وہاں جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس طرح کے عصمت دری کے کئی کیس ہیں جن کا علاج ہو رہا ہے، اور یہ صرف ایک شب میں پیش آیا تھا۔

بوسنیا میں مسلمان صحافیوں کے ساتھ ملاقات رہتی تھی۔ ایک سعودی صحافی سے دیر تک اسلام اور مسلمانوں سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میری باتیں سن کر اس صحافی نے وہی کہا جو بیروت کی مسجد کے امام نے کہا تھا: "آپ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ آپ کا دل تو مسلمان ہے۔ آپ اسلام قبول کر لیں گے تو اسلام سے متعلق بہت سے سوالات کا جواب خود بخود مل جائے گا"۔ مسلمان صحافی کا یہ جملہ اس وقت سے برابر میرے ذہن میں گردش کرتا رہا ہے۔

میں نے بوسنیا کے قیام کے دوران ایک مسلمان خاندان کو امریکہ علاج کے لیے بھجوانے کا انتظام کیا تھا۔ اس خاندان کے سرپرست کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کا ایک گردہ بالکل بے کار ہو گیا تھا۔ جس ہسپتال میں ہم نے اس خاندان کے سربراہ کو علاج کے لیے داخل کیا تھا' وہاں سے ہمارا برابر رابطہ رہا۔ اس دوران میں نے قرآن شریف کا مطالعہ شروع کر دیا تاکہ بہتر طریقے سے براہ راست اسلامی تعلیمات کو سمجھ سکوں۔ قرآن مجید میں چند ہی دنوں میں مجھے اپنے ان سوالوں کا جواب تشفی بخش مل گیا جس کے لیے میں برسوں سے پریشان تھا اور مجھے انجیل اور اس کے عالموں نے مایوس کر دیا تھا۔

میں بوسنیا سے واپس آیا تو تیسرے دن اس خاندان سے ملنے ہسپتال گیا تاکہ ان کے حالات معلوم کروں۔ مجھے معلوم ہوا کہ مریض ہونے کے باوجود وہ یہاں ایک قریبی مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے جاتے ہیں۔ میں نے اس بوسنی مسلمان مریض کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس وقت میں نے بڑے تاثر سے کہا کہ آپ کے دین اسلام میں سب کچھ ہے' اور یہی اصل دین ہے جس پر پوری انسانیت کی نجات کا انحصار ہے۔ میں جب یہ جملہ کہہ رہا تھا' اس وقت میری عجیب کیفیت تھی۔ اندر سے مجھے شدید خواہش ہو رہی تھی کہ اپنے اسلام کا اعلان کر دوں اور ابھی گھر' جا کر نمازیں پڑھنے لگوں۔

میں جب گھر واپس آیا تو دوسرے دن اس بوسنی مسلمان کے انتقال کی افسوس ناک اطلاع ملی۔ میں تیزی سے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ہم سے پہلے اس شہر میں موجود مسلمانوں کی بڑی تعداد تجہیز و تکفین کے لیے پہنچ چکی ہے۔ یہ وہ مسلمان تھے جو بھارت' پاکستان' سعودی عرب' کویت اور دیگر اسلامی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کوئی رشتے داری مرحوم سے نہیں تھی' لیکن وہ سب اس طرح شریک تھے جیسے یہ ان کے فرد خاندان اور بزرگ ہوں۔ ہر شخص اس خاندان کے افراد کی دلجوئی اور تسکین و دلاسے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ ہر شخص متاثر اور غمگین تھا۔ یہ میرے لیے نئی بات تھی۔ جب میرے مرحوم بوسنی دوست عثمان کے جسم کو غسل دیا جا رہا تھا' میں نے عین اسی وقت کلمہ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اسی لمحے میری زندگی یکسر تبدیل ہو گئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد صرف بوسنیا ہی نہیں' میرے اندر دنیا بھر کے مسلمانوں کی مدد کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا' اس لیے کہ وہ سب میرے بھائی ہیں اور اسلامی اخوت عالمگیر ہے۔

لٹریچر کا روزانہ کچھ نہ کچھ مطالعہ اپنی عادت بنائیے!

انسانی نفسیات کا عملی مطالعہ

کارکنوں اور قارئین کے لیے آئینہ

سیدمودودیؒ

عملی رہنمائی دیتے ہیں

تحریک اسلامی کی کامیابی کی شرائط

تزکیہ و تذکیر کے لیے

ایک بار پڑھیے' بار بار پڑھیے

ملک بھر کے تحریکی مکتبوں سے حاصل کیجیے

عطیہ اشتہار

SEARS International

COMPUTERS, PRINTERS, MONITORS & FAX MACHINE

58, First Floor, Hafeez Centre, Gulberg III, Lahore. Pakistan.

Tel: 92-42- 5752247-48 Fax: 92-42-5752249

رمضان المبارک رعایتی سکیم

کتاب	مصنف	قیمت	رعایتی قیمت
فضائلِ قرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	39/-	23/-
کتابُ الصّوم	"	75/-	45/-
شعورِ حیات اوّل	مولانا محمد یوسف اصلاحی	39/-	23/-
شعورِ حیات دوم	"	39/-	23/-
گلدستہ حدیث	"	15/-	9/-
شمعِ حرم	"	30/-	18/-
ایمان اور اخلاق	عبدالحمید صدیقی	48/-	29/-
خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت اوّل	ابو محمد امام الدین	21/-	13/-
" " " " دوم	"	21/-	13/-
خاصانِ خدا کا خوفِ نماز	"	21/-	13/-
مطالعہ حدیث	محمد فاروق خان	75/-	45/-

البدر پبلی کیشنز 23- راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000 فون: 7225030

● یہ رعایتی سکیم رمضان المبارک کے لیے ہے۔ ● ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

Adarts-HMPT-22/95

اخبار امت

الجزائر: ظلم کا سلسلہ کب تک؟

امجد عباسی

امت مسلمہ کا یہ کیسا المیہ ہے کہ اس کا ایک عضو اذیت اور تعذیب کا شکار ہو (اپنوں ہی کے ہاتھوں) اور امت کے باقی اعضا آرام و اطمینان سے ہوں! الجزائر میں بے گناہ شہریوں کو ذبح کر کے ہلاک کرنے کے روح فرسا واقعات اتنے تسلسل سے اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں کہ پڑھنے والوں کا احساس بھی کند ہو گیا ہے۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ یہ کارروائی کرنے والے درحقیقت سرکاری ایجنسیوں کے افراد ہیں۔ فوجی کیمپوں کے پڑوس کی آبادیوں میں کارروائی ہوتی ہے' کوئی پکڑا بھی نہیں جاتا اور فوجیوں کے سامان میں نقلی ڈاڑھیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ الجزائر کے تعذیب خانوں میں اسلام کا نام لینے والے بے گناہ مردوں اور عورتوں پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے جا رہے ہیں وہ ایک الگ کہانی ہے۔ اس کی تفصیلات پہلی بار مستند طور پر برطانیہ کے اخبار انڈی پنڈ نٹ (۳۰ اکتوبر ۹۷) میں رابرٹ فسک (Robert Fisk) سامنے لایا ہے۔ کاش یہ خصوصی اسٹوری (scoop) کوئی پاکستانی صحافی لاتا!

تفصیلات رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہیں۔ بیان کا یارا نہیں۔ خاتون پولیس کی ۳۰ سالہ دلیلہ خود ٹارچر کرنے میں شریک رہی ہے۔ اس کے دل میں ہمدردی کی کوئی رمق جاگی تو اس نے گینگرین کے شکار ایک ۵۵ سالہ مظلوم کو کچھ پنسلین فراہم کر دی۔ اس جرم میں اس کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا تو وہ بچتی بچاتی' لندن پہنچی۔ اب وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی ہے اور ماہر نفسیات کے زیر علاج ہے۔

دلیلہ کا کہنا ہے: "وہ ٹارچر کرتے تھے۔ میں دیکھتی تھی۔ معصوم نوجوانوں کو جنگلی جانوروں کی طرح ٹارچر کیا جاتا تھا۔ میں کیا کرتی' میں نے خود یہ ٹارچر سیشن دیکھے۔ وہ لوگوں کو رات ۱۱ بجے قتل کرتے تھے' جن کا کوئی قصور نہ تھا' جنھوں نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا ہوتا۔ ان کے مخالف بس یہ اطلاع دیتے ہیں کہ یہ دہشت گرو ہے اور اس شخص کو گرفتار کر کے اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا جاتا ہے"۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے خود' کئی ماہ تک' روزانہ ۱۲ کے حساب سے' ایک ہزار افراد کو ٹارچر کا شکار ہوتے دیکھا۔ کارروائی صبح ۱۰ بجے شروع

ہوتی، اور رات ۱۱ بجے تک شفٹوں میں جاری رہتی تھی۔

دلیلہ بتاتی ہے کہ میں نے ایک دفعہ افسر بالا حامد سے احتجاج کی کوشش کی: "آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، وہ بھی مسلمان ہیں۔ مارنے سے پہلے، کوئی ثبوت تو ہونا چاہیے!" اس نے جواب دیا: "لڑکی! پولیس میں تمھارا کام نہیں ہے۔ جس پر بھی شبہ ہو، اسے مار دو۔ اسی طرح تمھارا پروموشن ہو گا"۔

دلیلہ نے فسک کو بتایا کہ Cavignac پولیس اسٹیشن کے تعذیب خانے میں روزانہ دس بارہ افراد ہلاک ہو جاتے تھے۔ وہ پکارتے رہ جاتے تھے کہ "اللہ کے لیے، ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ہم سب ایک ہیں۔ تمھاری طرح مسلمان ہیں" لیکن جلادوں پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ انھیں نیم عریاں یا عریاں کر کے ٹکٹکی پر باندھ کر ناقابل بیان اذیت دی جاتی تھی۔ منہ میں پانی کا پائپ باندھ کر اتنا پانی بھرنا کہ پیٹ پھٹ جائے، خواہ ہلاکت واقع ہو جائے، پسندیدہ ٹارچر تھا۔ کہتے تھے کہ دستخط کرو کہ تم نے فلاں فلاں کو قتل کیا ہے۔ بعض قیدیوں کے داڑھی ہوتی تھی، بعض کے نہیں بھی ہوتی تھی۔ دو دن میں ایک دفعہ روٹی دی جاتی تھی۔ پولیس کا اعلیٰ افسر حکم دیتا کہ ان کی "مہمان داری" کی جائے اور ٹارچر کا عمل شروع ہو جاتا تھا۔

دلیلہ نے بتایا کہ خواتین قیدیوں کو Chateanuet پولیس اسٹیشن کے ایک خاص حصے میں لے جایا جاتا جسے "جرائم کے خاتمے کی قومی تنظیم" کا نام دیا گیا تھا۔ یہاں خفیہ پولیس والے صرف خصوصی پاس پر داخلے کی اجازت دیتے تھے۔ بڑے افسر ہی یہاں جا پاتے تھے۔ بالآخر یہاں بھی قتل کیا جاتا تھا۔

فسک لکھتا ہے کہ انڈی پنڈنٹ نے شہادتیں جمع کی ہیں کہ الجزائر میں فوج کی حمایت سے قائم حکومت کی پولیس نے تقریباً ۱۲ ہزار شہریوں کو گھروں سے اٹھا کر غائب کر دیا ہے۔ سیکیورٹی فورس کے کچھ لوگوں نے برطانیہ میں پناہ لے کر واقعات بیان کیے ہیں کہ کس طرح سرکاری سرپرستی میں بڑے پیمانے پر ٹارچر کی کارروائیاں (mass torture) چار سال سے جاری ہیں۔ ناخن اکھاڑے جا رہے ہیں، تیزاب بھرے کپڑوں سے دم گھوٹا جا رہا ہے، پیٹ میں پانی بھرا جا رہا ہے، خواتین کو گینگ ریپ کا شکار کیا جا رہا ہے۔ جب کوئی "غائب" (disappeared) کر دیا جاتا ہے تو اس کے رشتے دار ۲، ۳ ماہ پولیس اسٹیشن کے چکر کاٹتے ہیں اور پھر صبر کر لیتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ ان کا عزیز انسانی حقوق کے علم بردار، مہذب، مغرب کی حمایت سے قائم فوجی حکومت کی نذر ہو گیا ہے۔

ایک ۲۳ سالہ فوجی کا بیان ہے کہ اس نے ایک قتل گاہ میں افسروں کو "اسلامسٹ" قیدیوں کی ٹانگوں اور پیٹ میں ڈرل کے ذریعے سوراخ کرتے دیکھا۔ انسپکٹر عبدالسلام جو ایرپورٹ کے قریب دارلبیدہ پولیس اسٹیشن کا انچارج تھا، بتاتا ہے: "قیدیوں کو تیزاب پینے پر مجبور کیا جاتا تھا، یا چہرے پر کپڑا ڈال کر تیزاب چھڑک دیا جاتا تھا"۔

۴۶ سالہ وکیل محمد طاہری نے مظلوموں کی داد رسی کو اپنی زندگی کا مشن بنایا ہے۔ اس کی فائلوں میں

بے شمار تصاویر اور مستند معلومات موجود ہیں۔ وہ خود بھی ہر وقت "غائب" کیے جانے کے خطرے میں ہے۔ اس نے بتایا کہ ۲۳ سالہ نائمہ اور ۲۹ سالہ نجوعہ بوغلامہ دو بہنیں تھیں۔ دونوں اس عدالت میں کلرک تھیں جس کا جج بدقسمتی سے ان مشتبہ اسلامسٹوں کی فہرست کی تفتیش کر رہا تھا جو سوئس ایجنٹوں نے تیار کی تھی اور ایک سوئس اہلکار نے الجزائری خفیہ پولیس کو فروخت کی تھی۔ دونوں کو سرکاری ایجنٹوں نے اغوا کیا۔

۲۸ سالہ امینہ بسلیمان کا قصور یہ تھا کہ اس نے تباہ حال عمارتوں اور قبرستانوں کی تصاویر لی تھیں تاکہ شہریوں کے خلاف حکومت کے تشدد کا ثبوت فراہم ہو۔ اس کو ۱۳ دسمبر ۱۹۹۴ کو گرفتار کیا گیا اور پھر نہیں دیکھا گیا۔ اس کی والدہ کو کہا گیا ہے کہ اب اسے دیکھنے کی امید نہ رکھے۔

فسک نے لکھا ہے کہ جب بھی طاہری کوئی تصویر مجھے دکھانے کو نکالتا ہے تو میری نظر درجنوں تصاویر پر پڑتی ہے۔ جوان' بوڑھے' لڑکیاں' داڑھی والے' بے داڑھی والے' سب مشتبہ اسلامسٹ۔ ۶۷ سالہ احمد عبود ان میں سب سے بڑے اور ۱۰ سالہ ابراہیم سب سے چھوٹا ہے۔ سعیدہ خروبی' جس کے بال ڈیانا جیسے ہیں' ایک اسلامی گروپ کے مطلوب فرد کی بہن تھی۔ اس سال ۷ مئی کو اسے غائب کر دیا گیا۔ تشدد سے اس کے پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹنے کا معلوم ہوا ہے۔

ٹارچر کے ان ناقابل یقین واقعات کا' اس بیسویں صدی میں' نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ یہ وہ ہے جو سامنے آ گیا ہے' جو نہیں آیا وہ معلوم نہیں کتنا ہے۔

مسلم ممالک کے عوام کے ساتھ ان کی ناجائز حکومتیں یہ سلوک کرنے میں کیوں کامیاب ہیں؟ پہلے ان کے جمہوری فیصلے کو مسترد کیا جاتا ہے اور پھر فوجی جنرلوں کا ٹولہ ریاست کی مشینری کو اسلام کا نام لینے والوں کا نام و نشان مٹانے کی بزعم خود غلط پالیسی پر عمل میں لگانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یقیناً مغرب قصوروار ہے کہ ان ظالموں اور جابروں کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے' لیکن امت مسلمہ کے بیدار عناصر' کیوں سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتے ہیں؟

مجھے ایک مقرر کی یہ بات یاد آتی ہے کہ جب تک آپ دوسرے پر ظلم کو اپنے پر ظلم نہ سمجھیں گے' ظلم کا سلسلہ نہ رکے گا۔ اگر جمال عبدالناصر کو اخوان پر ظلم نہ کرنے دیا جاتا' تو عالم اسلام میں ان قصائیوں کی حکمرانی کے راستے بند ہو جاتے۔ اگر آج الجزائری حکومت کے ان مظالم کو ہم اپنے پر ظلم سمجھیں تو بہت سے راستے موجود ہیں۔ ۵۰ کے عشرے میں تو رسل و رسائل کا یہ دور نہ تھا جو آج ہے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ ایک برادر اسلامی ملک میں ۴ سال سے جاری اس سلسلہ تعذیب کی خبر ہمیں ایک مغربی نامہ نگار دے رہا ہے! کیا دنیا بھر کے "اسلامسٹ" ' الجزائری حکومت کو دنیا میں نکو نہیں بنا سکتے کہ مغرب کے لیے اس کی سرپرستی ناممکن ہو جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ مسلمان جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے' اس مسلمان سے افضل ہے جو لوگوں سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور ان کی تکلیفوں پر صبر نہیں کرتا"۔ (ترمذی)

ایک چراغ اور بجھا!

سید منور حسن

محمود اعظم فاروقی رحمہ اللہ بھی اپنے رب سے جا ملے!

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ - وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن ۵۵:۲۶-۲۷)، رہے نام اللہ کا!!

محمود اعظم فاروقی، نصف صدی سے زائد جماعت کے ساتھ بحیثیت رکن وابستہ رہے۔ اس دوران انھوں نے سرکاری ملازمت ترک کر کے بے روزگاری کا سامنا بھی کیا، قید و بند کے مراحل سے بھی گزرے---- اور ۱۹۶۴ میں جب ساری قیادت پابند سلاسل ٹھیری اور جماعت غیر قانونی قرار پائی تو حکومت سے قانونی جنگ لڑنے اور جماعت کو اپنے پیروں پر کھڑا رکھنے اور گرفتار شدگان کے اہل خانہ کی تشفی کا سامان کرنے کے لیے چودھری رحمت الٰہی اور مصباح الاسلام فاروقی مرحوم کے ساتھ سرگرم اور مستعد رہے۔

۱۹۵۷ میں "ماچھی گوٹھ" سے بھی گزرے۔ خود انھوں نے بتایا کہ وہ ذہنی طور پر مضطرب تھے، بے چینی اور بے یقینی نے انھیں آگھیرا تھا اور وہ اپنے اندر کئی طوفان اٹھتے دیکھ رہے تھے، لیکن چودھری غلام محمدؒ کے تدبر اور دیگر رفقا کی ہم رکابی اور "موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں" کے احساس نے اجتماعیت سے دور نہ ہونے دیا۔

فاروقی صاحب پر یہ مراحل بار بار آئے---- جس وقت جماعت نے پاکستان قومی اتحاد کے فیصلے کے مطابق ضیاء الحق مرحوم سے تعاون کا فیصلہ کیا---- فاروقی صاحب اس وقت بھی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوئے۔ انشراح صدر کی پونجی ادھر ادھر کر بیٹھے، یکسوئی کی دولت بکھرتی نظر آئی لیکن جماعتی فیصلے پر کاربند رہے۔ اداروں اور اجلاسوں میں اپنی تلی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ تکلم کا ان کا اپنا انداز تھا۔ کسی کے ساتھ رو رعایت کے قائل نہ تھے، بڑا ہو یا چھوٹا۔ تند و تیز جملے اور الفاظ کی کاٹ، کبھی کبھار تلخی بھی گھول دیتے تھے لیکن اپنائیت اور جماعت کی خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی۔ ان کا پیرایہ اظہار، انفرادیت لیے ہوئے تھا۔

ابھی حال ہی میں ایک بار پھر انھیں جماعتی زندگی میں اشکال پیدا ہوا۔ نامہ و پیام، سوال و جواب،

اعتراضات کی یورش، میں نے ان سے طویل گفتگو کی تو گویا ہوئے: "تم نے مجھے لاجواب تو کر دیا لیکن اطمینان نہیں ہوا، شاید کچھ وقت لگے"۔

پچپن سال سمع و اطاعت کے جماعتی نظم سے وابستہ رہنا، خود ایک اعزاز ہے۔ یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔ ذاتی پسند اور ناپسند کے پیمانے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ اجتماعی مفاد اور اجتماعی ترجیحات اپنے آپ کو منواتی ہیں اور فرد کی تربیت اور تزکیے کا عنوان فراہم ہو جاتا ہے۔ ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

حقیقت یہ ہے کہ جب تک رضائے الٰہی کی طلب دل میں رچی بسی نہ ہو اور حصول جنت آرزوؤں کا محور نہ بن جائے، ممکن نہیں ہے کہ طبیعت کے میلان اور مزاج کی اٹھان سے متصادم آرا اور فیصلے قبول کیے جا سکیں اور حضرت عمرؓ کا یہ قول قلب و ذہن میں فیصل ہو جائے کہ اسلام بغیر جماعت کے نہیں، اور جماعت بغیر امارت کے نہیں، اور امارت بغیر اطاعت کے نہیں۔

فاروقی صاحب نے اٹھتر سال عمر پائی اور بھرپور زندگی گزاری۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے وہ اس وقت رکن رہے (۱۹۶۵) جب امیر محمد خان کالا باغ گورنر تھے اور حبیب جالب پکار پکار کر کہہ رہے تھے:

کب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے مشعلیں کرو روشن دُور تک اندھیرا ہے

فاروقی صاحب مشعلیں روشن کرتے رہے، جبر کی پالیسیوں کو آڑے ہاتھوں لیتے رہے اور اندھیروں کا مقابلہ اجالوں سے کرتے رہے۔ فاروقی صاحب پاکستان کی قومی اسمبلی (۱۹۷۱-۱۹۷۷) کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۷۷ کے قومی انتخابات میں بھی وہ کامیاب ہوئے، لیکن اسمبلی میں نہ بیٹھ سکے۔ انتخابات کالعدم قرار پائے۔ کراچی یونی ورسٹی سینیٹ کے رکن بھی رہے اور اس سے قبل بلدیہ کراچی کے کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹیرین کی حیثیت سے خوب خوب اپنا لوہا منوایا۔ برجستگی، حاضر جوابی، چٹکلے، لطیفے، شعر گوئی اور پھر سنجیدگی و متانت کے ساتھ ایشوز پر اظہار خیال، بجٹ، قانون سازی اور ۱۹۷۱ کی اسمبلی میں دستور سازی میں بھرپور تیاری کے ساتھ شرکت ——— اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور اور فارسی شعر و ادب کا ذوق، ان کی تقریر اور گفتگو کو چار چاند لگا دیتا تھا۔ جماعت اسلامی اور حزب اختلاف کی نمایندگی کا حق ادا کرتے رہے۔

پیشے کے اعتبار سے اکاؤنٹنٹ تھے۔ جماعت کے مالی امور پر جب بات کرتے تھے تو پائی پائی کا حساب طلب کر لیتے تھے اور چمڑی جائے دمڑی نہ جائے کا اسلوب اپناتے تھے۔ لہجے کی تلخی عیاں تھی اور احتساب کی میزان، حساب کے بغیر ہٹنے نہ دیتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے، سرکاری ملازمت میں تھے کہ حکومت پاکستان نے اعلان کر دیا کہ سیاسی جماعتوں کے ارکان ملازمت میں نہیں رہ سکتے۔ اس زمانے میں سرکاری ملازمت بڑی نعمت جانی جاتی تھی، سماجی مرتبے کی علامت سمجھی جاتی تھی لیکن فاروقی صاحب نے بغیر کسی تردد و ادنیٰ تامل کے، ملازمت سے

استعفادے دیا اور تحریک اقامت دین کی زکنیت چھوڑنے کا تصور بھی قریب نہ پھٹکنے دیا۔ پلٹ کر یہ بھی نہ سوچا کہ معاش کا کیا بنے گا، کیا کھائیں گے اور کہاں سے لائیں گے۔ اللہ نے اس ایثار کو قبول کیا اور بقول فاروقی صاحب کے، جتنے افراد نے بھی سرکاری ملازمت سے استعفادے کر جماعت سے وابستگی کو برقرار رکھا، سب ہی خوب پھلے پھولے اور اللہ نے رزق کے دروازے ان سب پر کھول دیے۔

فاروقی صاحب کا شعری ذوق بھی پائے کا تھا۔ اردو اور فارسی کے ان گنت اشعار یاد تھے اور برجستہ انھیں پڑھتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت ان کا محبوب مشغلہ تھا، حافظہ بھی اچھا تھا، اچھے شعر فوراً یاد ہو جاتے تھے۔ قصہ گوئی اور لطائف سے محفل سجاتے تھے۔ مجلس آرائی ان پر ختم تھی۔ اسی لیے نوجوانوں، ادبی ذوق رکھنے والوں اور، کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔۔۔ کے متوالوں کو ان کے گرد اکٹھا رہنے کا عنوان مل جاتا تھا۔

ہر ایک کی خوشی میں شرکت اور ہر ایک کا غم بانٹنا، فاروقی صاحب کا امتیازی وصف تھا۔ ہر متاثر فرد کے گھر تعزیت کے لیے چل کر جانا اور جس نے بھی دعوت دی ہو، اس کے در پر پہنچنا، ان کی ایسی خوبی تھی جو قابل ذکر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ کراچی جیسے مصروف اور لمبے لمبے فاصلوں والے شہر میں جسے یہ فرض ادا کرنا ہو، اسے روزانہ ہی وقت کا ایک معتدبہ حصہ اس کام میں صرف کرنا ہوتا ہے اور فاروقی صاحب نے اس بارے میں اچھی مثال چھوڑی ہے۔

فاروقی صاحب مسلسل گھنٹوں کام کرنے اور کم وقت میں زیادہ کام کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتے تھے۔ جنھوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے وہ اس کے گواہ ہیں کہ بے تکان کام کرنا، چاق و چوبند رہنا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کام میں جتے رہنا ان کی عادت تھی۔ وہ ایسی ہی کارکردگی کا مطالبہ اپنے رفقا سے بھی کرتے تھے اور اکثر سست روی اور بوجھل کر دینے والے رویوں کی خبر بھی لے لیتے تھے۔ تنظیم جماعت کو فعال اور متحرک رکھنے میں فاروقی صاحب کی یہ خصوصیت ان کی پہچان بن گئی تھی۔

جماعت اسلامی ایک دینی تحریک ہے۔ یہ اپنے جلو میں چلنے والوں، اپنی ڈالیوں پر بسیرا کرنے والوں کو دینی رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ فاروقی صاحب کا تعلیمی پس منظر مشنری تعلیمی اداروں کا تھا۔ سماجی اعتبار سے بھی کھاتے پیتے زمیندارانہ ماحول سے نسبت تھی۔ لیکن ۱۹۴۳ میں جماعت سے عشق ہو جانے کے بعد سے مسلسل اس رنگ میں رنگتے گئے، صبغۃ اللہ جسے کہیں۔ نماز باجماعت پڑھنے کی پختہ عادت، مطالعے کا ذوق اور اس میں باقاعدگی، رفقا سے رابطے، رات دیر گئے تک جماعتی سرگرمیوں میں مصروف رہنا اور تاخیر سے سونے کے باوجود، فجر کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرنا، شوریٰ اور دیگر تمام اجتماعات میں پابندی وقت کا خصوصی خیال رکھنا، ایسے معمولات تھے جو ہنگامی حالات میں بھی متاثر نہ ہوتے تھے۔ اپنے عزیز و اقارب اور رشتے داروں کے لیے انھوں نے ہفتے میں ایک دن مختص کیا ہوا تھا تاکہ اس دائرے کے حقوق بھی ادا ہو سکیں۔

انسانوں کی اجتماعیت میں کسی کا روٹھ جانا' کسی کا نظرانداز ہو جانا' کاررواں سے ٹوٹ جانا' حرم سے بدگمان ہو جانا' تصورات کی مالا سے موتیوں کا بکھر جانا --- ایک فطری عمل ہے۔ جہاں چار برتن ہوں گے' کھناکا تو ہو گا۔ لہٰذا شب و روز کے اجتماعات' شورائیں' احتساب اور جائزے' تبادلہ خیال اور کلامی بحثیں --- نازک آبگینوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کی کوشش کے باوجود' ٹھیس پہنچانے کا وافر سامان فراہم کر دیتی ہیں۔ کوئی تندی گفتار کا رسیا' کوئی گرمئی گفتار کا عادی' کسی کا پیمانہ اس طرح لبالب بھرا ہوا کہ اشارہ ابرو پر چھلک چھلک جائے۔ فاروقی صاحب خود بھی اس کلچر کو فروغ دیتے تھے اور اس لے کو بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے' لیکن پلک جھپکتے میں اور یہ احساس ہوتے ہی کہ کسی رفیق کی دل آزاری ہوئی ہے' جسے ٹھیس پہنچی ہو' جس کا دل دکھا ہو' اس سے معذرت طلب کرنے میں تاخیر نہ کرتے تھے' قصہ زمین بر سر زمین کے عادی تھے۔

میں نے ان کے ساتھ طویل مدت تک کام کیا' مختلف حیثیتوں میں کیا' وہ نہایت بے تکلف دوست' قابل اعتماد رفیق' مشفق' محب اور مہربان بزرگ تھے اور جماعت و تحریک کے حقیقی خیرخواہ بھی۔ تحریک ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے تھی اور خون کی طرح ان کے جسم میں گردش کرتی تھی۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اور شب و روز کی سرگرمیوں کا محور' تحریک تھی۔

اگر میری گواہی قبول ہو سکے تو میں شہادت دیتا ہوں کہ انھوں نے بہت کچھ ترک کر کے اس راستے کو اختیار کیا تھا' حق مغفرت کرے ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

رسائل و مسائل

خواتین کا سفر

نامحرم کے ہمراہ سفر یا بغیر محرم کے سفر کے سلسلے میں درج ذیل سوالات ہیں:

۱۔ کسی خاتون کا ایک شہر کے اندر ایک مقام سے دوسرے مقام تک بذریعہ ٹیکسی، رکشہ یا کسی اور سواری میں تنہا سفر کرنا جو ۲۰-۲۵ کلومیٹر طویل ہو، ۲۔ خاتون کا ایک شہر سے دوسرے شہر تک، بغیر محرم بذریعہ بس یا ریل سفر کرنا، ۳۔ خاتون کا ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان ہمراہ گھریلو ڈرائیور یا دفتری ملازم ڈرائیور سفر کرنا، ۴۔ چند خواتین کا مشترکہ طور پر ایک نامحرم کے ہمراہ سفر کرنا، ۵۔ دو مقامات کے درمیان ۲ یا ۳ گھنٹے کا فضائی سفر بغیر محرم کرنا، ۶۔ نامحرم کا عمر میں ۶۰ سال سے اوپر ہونا، ۷۔ خاتون کا بڑی عمر کا ہونا، ۸۔ دور دراز مقام پر عورت کا بغیر محرم، خواتین کے درمیان چند روز قیام کرنا، ۹۔ شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ عورت کا بغیر محرم سفر کرنا، نیز کیا دونوں میں کوئی فرق ہے؟ ۱۰۔ تبلیغی مقاصد کے لیے سفر کرنے اور نجی سفر کرنے میں کیا محرم و نامحرم کے حکم میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے؟

شریعت نے سفر کے لیے خواتین کو کچھ اصولی ہدایات دے دی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ایک خاتون کو سفر کرنا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک عورت ایک دن رات کا سفر بغیر محرم کے نہ کرے اور ایک روایت میں تین دن رات کے سفر کا ذکر ہے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ کوئی خاتون کسی غیر محرم مرد کے ساتھ تنہائی نہ کرے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ایک عورت کسی مرد کے ساتھ تنہائی نہ کرے گی مگر ان کا تیسرا شیطان ہو گا"۔ فقہا نے تین دن رات کے سفر کو محرم یا خواتین کی جماعت کے بغیر کرنے کو ناجائز کہا ہے اور دن رات کے سفر کو محرم یا خواتین کی جماعت کے بغیر، خلاف اولیٰ کہا ہے۔ اسی طرح تنہائی، جس میں کوئی دوسرا نہ آ سکتا ہو، دروازے بند ہوں، بھی جائز نہیں ہے۔ ان دو اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔ ان اصولوں کی روح یہ ہے کہ سفر تھوڑا ہو یا زیادہ، اس کو پرامن ہونا ضروری ہے لیکن اس کا اہتمام مختلف خواتین کے لحاظ سے مختلف ہے۔ اس لیے اس کے لیے کوئی متعین ضابطہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ حالات کے لحاظ سے ایک خاتون اپنے شوہر

اور گھر کی دوسری خواتین اور نظم جماعت کے مشورے سے اس کا تعین کرے گی۔ بعض اوقات دو تین خواتین ایک گاڑی میں متعارف معتمد علیہ اور قابل اطمینان ڈرائیور کے ساتھ سفر کر سکتی ہیں لیکن ناواقف ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ نہیں۔ اس طرح کی صورتوں کے لیے شریعت میں "استفت قلبک" اپنے دل سے فتویٰ پوچھو کا اصول آیا ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں اسے "رائے مبتلی بہ" کہا جاتا ہے، یعنی جو خاتون یا شخص مسئلے سے متعلق ہے، اس کی رائے کا اعتبار ہو گا۔ جہاز، بس، گاڑی میں سفر کرنے کی جو مختلف صورتیں ہیں، ان سب میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ فتنے کا خطرہ نہ ہو اور حفاظت کا انتظام ہو۔ بعض اوقات ایک نیک اور بزرگ عمر کے آدمی کی معیت میں خواتین کی ایک جماعت اطمینان سے سفر کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں بغیر محرم کے سفر کی اجازت ہو گی۔ ۲۰/۲۵ میل یا اس سے کم سفر کا فیصلہ مذکورہ اصولوں کی روشنی میں ہر سفر کے بارے میں الگ سے باہمی مشورے سے کیا جانا چاہیے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ آج کل ڈکیتی، دہشت گردی، عصمت و عفت پر حملے کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں، ان سے حفاظت کا بھی پورا اطمینان کر لیا جائے۔ شہروں میں بسوں اور ویگنوں میں، ٹیکسیوں اور رکشوں میں اکثر سفر پر امن ہوتا ہے لیکن بعض ٹیکسیوں اور رکشوں والے ڈکیتیوں میں ملوث لوگوں سے منسلک ہوتے ہیں، ایسے حالات میں ناواقف ٹیکسی ڈرائیور اور ناواقف رکشہ ڈرائیور کے ساتھ سفر سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس اصولی جواب میں، بیش تر سوالوں کا جواب آگیا ہے:

۱- ایک شہر میں رکشہ، ٹیکسی کے ذریعے بیس پچیس میل طویل سفر کرنا، ۲- خاتون کا شہر سے دوسرے شہر بغیر محرم بذریعہ بس یا ریل سفر کرنا، ۳- خاتون کا ایک شہر سے دوسرے شہر گھریلو ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنا، ۴- چند خواتین کا ایک نامحرم کے ہمراہ سفر کرنا، ۵- دو مقامات کے درمیان ۲ یا ۳ گھنٹے کا ہوائی سفر بغیر محرم کرنا، یہ ساری صورتیں جائز ہو سکتی ہیں، اگر سفر میں کسی قسم کے فتنے کا خطرہ نہ ہو، اور ناجائز ہوں گی اگر کسی قسم کا خطرہ ہو۔ یہ فیصلہ شخص متعلق نے خود کرنا ہے کہ خطرہ ہے یا نہیں۔ شریعت اس چیز کو اس پر چھوڑتی ہے، ۶- نامحرم کا عمر میں ۶۰ سال سے اوپر ہونا، خاتون کا بڑی عمر کا ہونا، یہ چیزیں فتنے سے اطمینان پیدا کرتی ہیں بشرطے کہ متعلقہ خاتون کو اطمینان بھی ہو اور وہ ایسی صورت میں اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ سمجھتی ہو، ۷- چند روز دور دراز مقام پر محرم خواتین کے ساتھ قیام کرنا جائز ہے بشرطے کہ فتنے کا خطرہ نہ ہو، ۸- شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے لحاظ سے بھی بعض اوقات فرق واقع ہوتا ہے۔

تبلیغی سفر اور نجی سفر اپنے احکام کے لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں میں فتنے سے اطمینان لازمی ہے۔ واللہ اعلم۔ (مولانا عبدالمالک)

اختلافی مسائل پر صحیح رویّہ

ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر، جنھیں بعض حضرات فروعی بھی کہتے ہیں، بہت سے حضرات لڑتے جھگڑتے ہیں، دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا مناسب ہے؟

آپ کے سوال میں تین پہلو قابل غور ہیں: اولاً کیا اختلاف کی بنا پر دست و گریباں ہو جانا مناسب ہے؟ ثانیاً کیا لڑنا جھگڑنا خود جائز ہے اور ثالثاً کیا فروعی، جزوی اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں اختلاف اور جھگڑنے کی گنجایش ہے؟ قرآن و حدیث پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اختلاف کی بنا پر دست و گریباں ہونا کم از کم ایک مومن صالح کے لیے ممکن نہیں۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن پر ہاتھ نہیں اٹھاتا بلکہ وہ دوسرے مومن کی ڈھال ہوتا ہے۔ ایک فرد کے منافق ہونے کے لیے یہ کافی قرار دیا گیا ہے کہ جب بات کرے "تو تو، میں میں" پر اتر آئے اور غلط زبان کا استعمال کرے۔ گویا نہ صرف ہاتھ بلکہ زبان سے بھی کسی مسلمان بھائی کو اذیت پہنچانا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نامناسب اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔ قرآن کریم نے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کی جامع اصطلاح سے یہ بات واضح فرما دی کہ باہمی تعلق کی بنیاد شدت پرستی، نفرت، ٹکراؤ اور جھگڑا نہیں بلکہ مودت، رحمت، اخوت، انس، رواداری اور لطف و کرم ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے دو بھائیوں کے درمیان جھگڑے کی صورت میں یہ نہیں فرمایا کہ دور سے بیٹھ کر تماشا دیکھو اور نظارہ کرتے رہو کہ ایک، دوسرے کا کیا حشر کر رہا ہے، نہ یہ فرمایا کہ جب کبھی فرصت مل جائے اور کرنے کا کوئی کام نہ ہو تو صرف ایک آدھ نصیحت کر کے دونوں فریقوں کو متوجہ کر دو بلکہ سورۃ الحجرات میں یہ حکم دیا کہ اگر کوئی نزاع اور جھگڑا ہو تو اپنے بھائیوں میں صلح کرا دو۔ (فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اَخَوَيْكُم) اور اگر ان میں سے ایک حق کی طرف آنے کو تیار نہ ہو تو جو حق پر ہو، اس کا ساتھ دو۔ گویا اسلام خاموش تماشائی بننے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ انسانی فطرت کی اس کمزوری کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات نزاع اور جھگڑے کی شکل بہت بھلے اور نیک افراد کے معاشرے میں بھی ہو سکتی ہے، اور جب ایسا ہو تو ان کی اصلاح کرنا امت کا فریضہ ہے۔

اب اصل مسئلے کی طرف آیئے۔ اسلام وہ واحد دین ہے جو معقولیت کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ اختلاف کا حق دیتا ہے اور آزادی رائے اور شوریٰ کو دین کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں جس شوریٰ کا ذکر ہے وہ ہر بات پر مہر صداقت ثبت کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک سے زائد موقف، آرا اور اختلاف رکھتے ہوئے باہمی تبادلہ خیالات، دلائل کے تبادلے، غور و خوض کے

بعد عزم الامور [متفقہ فیصلہ] تک پہنچنے کا نام ہے۔ اس سلسلے میں لازمی طور پر مسائل چاہے فروعی و جزوی ہوں یا بنیادی اور کلیدی، ان پر تبادلہ خیال بھی ہو گا اور اختلاف بھی ہو گا، جب ہی تو شوریٰ ہو گی۔ گویا اسلام اختلاف کرنے کو نہ جرم سمجھتا ہے، نہ اس سے روکتا ہے بلکہ تعلیم و تربیت کے ذریعے وہ حریت فکر اور آزادی رائے کی تعلیم دیتا ہے جس میں ایک بوڑھی عورت بھی حضرت عمرؓ سے جب چاہے اور جہاں چاہے سوال کر لے اور ایک خاتون، خلیفہ وقت سے قرآن کی دلیل کی بنا پر مہر کے معاملے میں اختلاف کرتے ہوئے یہ کہہ دے: "عمرؓ! جو حق اللہ نے ہمیں دیا ہے، تم اسے محدود نہیں کر سکتے"۔

اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ غیر ضروری طور پر معمولی سے معمولی مسئلے میں جب تک اختلاف نہ کر لیا جائے، دین مکمل نہیں ہو گا۔ مسائل چاہے معمولی ہوں یا بڑے، اسلام میں اختلاف کرنے اور رکھنے کی گنجائش موجود ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس اختلاف کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی بنیاد موجود ہو۔

یہ اختلاف کیوں ہیں؟ انھیں کیسے دور کیا جائے، یہ ایک بالکل الگ مسئلہ ہے اور آپ کے سوال میں اس طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔ اس لیے جواب کو آپ کے سوال کی حد تک محدود رکھتے ہوئے میں صرف یہ گزارش کروں گا کہ اسلام نے اختلاف کا جو ادب و اخلاق ہمیں سکھایا ہے اس میں اختلاف رکھتے ہوئے باہمی محبت و اخوت کو شرط قرار دیا ہے۔ اگر ایک بھائی صلوٰۃ میں بالجہر آمین کہتا ہے اور ایک خاموشی سے، اگر ایک سینے کے اوپر قلب کے قریب ہاتھ باندھتا ہے اور ایک ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے تو جب تک سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے لیے بنیاد موجود ہے، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنی تعبیر اور رائے دوسرے پر مسلط کرے۔ جن حضرات کی طرف ہم رہنمائی کے لیے دیکھتے ہیں، انھیں اپنا امام کہتے ہیں، انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود محبت، احترام، حتیٰ کہ اپنے مسلک سے ہٹ کر ان کی پیروی کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ حضرت امام شافعیؒ نے جب مدینہ منورہ میں نماز پڑھی تو حضرت امام مالکؒ کی رائے کے احترام میں ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی کہ امام مدینہ ایسا کرتے تھے گو حضرت امام شافعیؒ کی اپنی رائے اس سنت کے حق میں تھی، جس میں ہاتھ سینے کے اوپر باندھ کر نماز پڑھنا افضل تھا۔

ہم جس امت کے افراد ہیں اس میں ہمارے ائمہ نے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے محبت و احترام کو ہر ہر سطح پر باقی رکھا۔ یہ ہماری اپنی تاریخ، روایت اور ثقافت سے لاعلمی ہے کہ ہم معمولی معمولی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر آپس میں دشمنی، جھگڑے اور فساد کا سبب بنا لیتے ہیں۔ قرآن عظیم نے سورہ الحجرات میں جس اخوت کی تعلیم دی ہے، یہ اس کے بالکل منافی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اختلافات جو بعض اوقات بالکل فطری ہوں گے، رکھنے کے ساتھ ساتھ باہمی محبت کو بڑھایا جائے۔

اخوت کا تقاضا ہے کہ اگر ہم کسی بھائی کو کسی دوسرے بھائی کے بارے میں نامناسب زبان استعمال کرتے ہوئے پائیں تو فوراً اس کی اصلاح کریں کہ حدیث نے صاف کہہ دیا: الدین نصیحہ۔ اگر وہ غلط بیانی کر رہا ہے تو فوراً متوجہ کر دیں کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہا ہے جو ایک انتہائی قابل کراہت عمل ہے اور کم از کم ہم اس عمل میں شامل ہونے سے انکار کریں اور عمل سے یہ ظاہر کر دیں کہ ہم کسی مردہ بھائی کا گوشت نہیں کھا سکتے۔ قرآن پاک نے اور حدیث شریف نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ بہت سے معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی کہ امت مسلمہ میں ایک سے زیادہ مسالک پائے جائیں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ حضرت جبرئیلؑ نے خود نمازوں کے اول اور آخر وقت تشریف لا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اول و آخر اوقات کی تعلیم فرمائی اور فرمایا کہ ان اوقات کے درمیان نماز پڑھنا درست ہے (بخاری، مسلم)۔ اگر نماز جیسی بنیادی عبادت میں اس بات کی گنجایش رکھی گئی تو اور بہت سے معاملات میں اختلاف کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہاں، اختلاف کا جو ادب و اخلاق ہے، اس پر عمل کرنا لازمی ہے۔

ہمارا اصل مسئلہ اختلاف نہیں اختلاف کے ادب کا ہے۔ جب تک امت مسلمہ کو تعلیم اور ابلاغ عامہ کے ذریعے سے یہ بات نہ سمجھائی جائے گی کہ وہ اخوت و محبت کے ساتھ ساتھ ایک سے زائد مسالک اختیار کر سکتی ہے، اس وقت تک ہم معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کو کافر کہتے رہیں گے۔ اسلام چاہتا ہے کہ وسعت و رواداری کو اختیار کیا جائے اور معمولی معمولی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جن امور میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان کے قیام میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر تعاون کیا جائے۔ کیا نماز کے اوقات اور نماز میں رفع یدین یا آمین بالجہر پر اختلاف کے باوجود ہم مل کر امت مسلمہ کو صلوٰۃ کی پابندی کی طرف نہیں بلا سکتے؟ کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے جو لوگ نماز نہیں پڑھتے ان تک دین کی دعوت پہنچانے کا کام نہیں کر سکتے؟ کیا یہ عقلی رویہ ہے کہ فرضیت صلوٰۃ جس پر کوئی اختلاف نہیں، اس کو چھوڑ کر نماز کے دوران بعض معمولی اختلاف پر تو مناظرے اور جھگڑے ہوں لیکن جو لوگ خود کو دین کا مبلغ سمجھتے ہیں وہ جس بات پر کوئی اختلاف نہیں، یعنی خود نماز کا ادا کرنا، اسے بھول جائیں، اس پر نہ متوجہ کریں نہ گرفت کریں! دراصل ہمیں اپنے طرز عمل پر تنقیدی نگاہ ڈال کر اس کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اس کے بعد معمولی اختلاف ہوں یا بڑے، وہ تشدد، نفرت اور زیادتی پر نہیں ابھار سکتے بلکہ اختلافات کے باوجود ہم ایک دوسرے سے محبت و تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ خود صحابہ کرامؓ اختلافات کے باوجود ایک دوسرے پر جان دیتے تھے اور اپنے بھائی کے تحفظ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اسلام اخوت اور بھائی چارے کا نام ہے۔ یہ افتراق و دشمنی کا دشمن ہے اور چاہتا ہے کہ امت ایک جسد واحد کی

طرح ہو جس میں ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو تمام جسم درد کی ٹیسیں محسوس کرے۔ یہ ٹوٹنے کی نہیں جوڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ آپؐ کو صلہ رحمی کے لیے بھیجا گیا، قطع رحمی کے لیے نہیں۔ آج صلہ رحمی کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ ہم امت مسلمہ کو صرف محبت و اخوت کے ذریعے ہی دوبارہ اس بلندی پر لے جاسکتے ہیں جو اس کا مقدر تھی۔ (ڈاکٹر انیس احمد)



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC Cashmira BLANKETS
ABC KNITTING YARNS
Plush Mink BED COVERS AND BLANKETS
SANAULLA CARPET YARNS
SANAULLA WEAVING YARNS
تیسری منزل نیو ٹما سینٹر فاطمہ جناح روڈ کراچی، پاکستان
Phones: 516034 & 516035: Fax: 92-21-5681775
Telex: 21699 SANA PK.

کتاب نما

افغانستان کی کہانی، حقائق کی زبانی ، ڈاکٹر مظفر احمد۔ ناشر: حرا پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۳۶۸۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

جہاد افغانستان کے نتیجے میں روس جیسی سپرپاور کی شکست و ریخت اس صدی کا اہم ترین واقعہ ہے لیکن جہاد کے ثمرات کو جس طرح اپنوں اور بیگانوں کی سازشوں سے سبوتاژ کیا گیا ہے، وہ ملت اسلامیہ کے لیے بہت بڑا المیہ ہے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی اور نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد ہونے والی سازشوں کی کہانی بیان کی ہے۔ مصنف نے خود افغانستان جاکر حالات کو قریب سے دیکھا اور پھر کتابوں، جرائد، آڈیو، وڈیو کیسٹوں اور مجاہد راہنماؤں سے گفتگوؤں کی روشنی میں حقائق کو یکجا کیا ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے تین ابواب میں مصنف نے اقوام متحدہ سمیت امریکہ، برطانیہ، فرانس اور صیہونی قوتوں کے مذموم کردار کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی ان طالع آزما "اپنوں" کی انا پرستی کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ جہادی قوتوں کی مخالفت کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کے خواب منتشر کیے ہیں۔ مصنف نے جو واقعاتی شواہد اکٹھے کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاد افغانستان کے مختلف ادوار میں حکمت یار کا نقطہ نظر حقائق پر مبنی اور بہتر تھا۔

ایک عرب مجاہد انجینئر شیخ عبدالجلیل برجی جہاد افغانستان کے ابتدائی دنوں میں مجاہدین کے شریک سفر ہوئے۔ بہت سے گشتی شفا خانے، ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم کیں اور ریلیف ایجنسیوں کے ساتھ مل کر مہاجرین کو بہت سی دیگر سہولتیں فراہم کیں۔ ان کے مراسم تمام افغان رہنماؤں سے ہیں۔ ان کی کتاب "الفتح والحزیمہ" کے ایک باب کا ترجمہ بھی شامل کتاب ہے۔ یہ چودہ دن کی ڈائری پر مشتمل ہے۔ افغان تنظیموں کے اختلافات دور کرانے کے لیے انھوں نے افغانستان کے مختلف حصوں میں طویل سفر کیے اور مجاہد سربراہوں سے مذاکرات کیے۔ یہ باب نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

آخری تین ابواب میں افغان تنظیموں اور ان کے قائدین، کمیونسٹ پارٹی، ظاہر شاہ، سردار داؤد، ترکی اور کارمل وغیرہ کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ کچھ نظمیں، بہت سی تصاویر بھی شامل ہیں جو واقعات کی تفہیم

میں معاون ہیں۔ معاہدہ جنیوا کے آرٹیکل نمبر ۱۱ کے متن کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔

مقدمہ مولانا عبدالرحیم چترالی نے تحریر کیا ہے۔ کتابت کی غلطیاں خصوصاً انگریزی الفاظ کے غلط ہجے بہت کھٹکتے ہیں۔ (عبداللہ شاہ ہاشمی)

سلمٰی کا مقدمہ' ڈھاکہ سے کراچی تک' نسرین پرویز۔ مجلد' صفحات: ۴۱۶۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

اپنے عنوان کے اعتبار سے یہ کتاب اس بات کا پتا دیتی ہے کہ اس میں مشرقی پاکستان کے خستہ حال اردو بولنے والوں کی وہ درد بھری کہانی ہو گی جس کا آغاز مارچ ۱۹۷۱ میں بہاریوں کے قتل عام سے شروع ہوا تھا۔ پھر وہ ڈھاکہ کے نواح میں "انسانی باڑوں" میں سسک سسک کر زندگی بسر کرتے رہے اور اس کے بعد وہ کراچی میں آئے مگر کتاب کا مطالعہ شروع کریں تو تھوڑی ہی دیر بعد منظر بدل جاتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے ذاتی رنج و الم اور دکھ درد کی خاص کیفیت کو' اپنے سیاسی اور مسلکی حوالے سے موضوع بحث بنایا ہے۔ مصنفہ کراچی یونی ورسٹی سے ابلاغیات میں ایم اے کے بعد کچھ عرصہ سرکاری ملازمت میں بھی رہی ہیں اور پھر ناانصافی کا شکار ہو کر بے روزگار ہو گئیں۔

اس کتاب کو ایک طرح کی آپ بیتی کہہ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں جس میں سیاسی و مسلکی جذبات و احساسات کی تپش بھری پڑی ہے۔ آج کراچی جس آگ میں جل رہا ہے' اس سے ملتی جلتی آگ اس کتاب میں اٹھتی دکھائی دیتی ہے' جس سے سارا منظر اتھل پتھل ہو کر رہ جاتا ہے۔ کتاب کا اگرچہ کوئی واضح ہدف نہیں' لیکن پھر بھی ایک ہدف تو موجود ہے' غالباً یہی اس کا مقصد تصنیف ہے۔ وہ لکھتی ہیں: "سلمٰی کے مقدمے" کا واحد مقصد خاص طور پر میرے اپنے مکتبہ فکر کے شیعہ حضرات کو' جو بھٹو خاندان کا سب سے بڑا ووٹ بنک ہیں' صرف یہ بتانا ہے کہ' خاندان بنو امیہ نے جس طرح خلافت کو بادشاہت میں تبدیل کیا' بھٹو نے ہر وہ کام کیا' جو بنو امیہ کے دور میں شروع ہوا" (ص ۱۱)۔ "اندھے' بہرے ان شیعوں سے میں کیا امید کر سکتی ہوں' جنھوں نے پاگل اور دیوانوں کی طرح آج سے ۲۵ برس پہلے ایک یزید کو بغض معاویہ میں ووٹ دیا اس لیے کہ چاروں طرف جاہل "ملا" تھے...... ان معصوم لوگوں کو ایک امید کی کرن وہ شیطان نظر آیا جس کا نام بھٹو تھا" (ص ۳۵۵)۔

نمونے کے یہ دو اقتباس قدرے نرم ہیں۔ کتاب میں اسی نوعیت کی سخت زبان سپاہ صحابہ کے لیڈروں کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح آگ بھڑکانے سے "سلمٰی کے مقدمے" کا فیصلہ ہو جائے گا؟ یا اس آگ سے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی بیٹیوں کی عزت و آبرو کو مزید خطرات لاحق ہو جائیں گے! یہ کتاب پڑھ کر ہمدردی کے کچھ جذبات پیدا ہوتے ہیں مگر اسلوب بیان کی ناہمواری سے ہڈیوں

میں خوف کی ٹھنڈک اترتی جاتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگ اپنے تئیں "ملا کی جہالت" پر تبرئی کر کے اپنی "روشن خیالی" کا چراغ روشن کرتے ہیں مگر کیا ان کے پاس بھی زبان و بیان کا یہی اسلوب رہ گیا ہے اور کیا اس سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟ "ملا" تو جاہل ہے، مگر "جدید تعلیم یافتہ" خاتون کو اپنے انداز گفتار پر غور کرنا چاہیے۔ جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر لکھی جانے والی اس کتاب نے اپنے اٹھائے جانے والے چند قیمتی سوالات کو بری طرح مسخ و مجروح کیا ہے۔ (سلیم منصور خالد)

MIDDLE EAST TERRORISM: CURRENT THREATS AND FUTURE PROSPECTS. By Yonah Alexander. Dartmouth Publishing Company, Hampshire, UK, 1994. ISBN 1-85521-510-1

TERRORISM AND THE MEDIA: FROM THE IRAN HOSTAGE CRISIS TO THE WORLD TRADE CENTRE BOMBING. By Brigitte L. Nacos. Columbia University Press, New York, 1994. ISBN 0-231-10014-0

سینٹ آگسٹائن (م: ۴۳۰ء) ایک دلچسپ کہانی سناتے ہیں: "ایک بحری قزاق کو پکڑ کے سکندر اعظم کے سامنے لایا گیا۔ سکندر نے اس سے پوچھا: تم سمندروں میں اتنے دھڑلے سے کیسے ڈاکہ زنی کرتے پھرتے ہو؟ اس نے جواب دیا: حضور، آپ ساری دنیا میں بڑے دھڑلے سے ڈاکے مارتے پھر رہے ہیں! فرق صرف اتنا ہے کہ میں یہ کام ایک چھوٹے سے جہاز سے کرتا ہوں، اس لیے میں ڈاکو کہلاتا ہوں، حضور یہی کام ایک عظیم فوج اور بحری بیڑے کے ذریعے عالمی پیمانے پر انجام دیتے ہیں، اس لیے آپ کو شہنشاہ کہا جاتا ہے"۔ (Chomsky, Pirates and Emperors-1)

دہشت گردی کے نام پر دنیا کی طاقتور اقوام نے کمزور اقوام کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے، اس کی تہ میں اصل سچائی کی کتنی صحیح تصویر یہ کہانی پیش کرتی ہے۔ یہ نہیں کہ دہشت گردی کوئی مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی بھی، بے گناہ افراد کو ہلاک یا خوف زدہ کرنے، یرغمالی بنانے، جہازوں کو اغوا کرنے یا دھماکے سے اڑانے اور شہری آبادیوں پر بمباری کرنے کو جائز سمجھتا ہے، چاہے اپنے جائز مقاصد کے حصول کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ دہشت گردی کی اصطلاح آج کے شہنشاہوں کا جدید ترین ہتھیار بن گیا ہے، بالخصوص امریکہ اور اسرائیل کا۔۔۔ ایک طرف اپنے توسیع پسندی کے مفادات اور جارحانہ عزائم کے لیے تھوک کے حساب سے کی جانے والی دہشت گردی کو چھپانے کے لیے اور دوسری طرف جس کو بھی وہ چاہیں، جو ان کے سامنے کھڑے ہونے کی جرات کر سکتا ہو، اس پر

دہشت گرد اور غنڈے کا ٹھپہ لگانے کے لیے' اور جو سزا مناسب سمجھیں' دینے کے لیے' عموماً کسی ذرہ برابر ثبوت کے بغیر۔

وہ سکہ رائج الوقت میں' طاقتور ہیں۔ پوری کی پوری آبادیوں کو دہشت زدہ کر دیتے ہیں۔ انھوں نے لیبیا اور لبنان پر بمباری کی۔ انھوں نے ہزاروں معصوم مرد' خواتین اور بچوں کو ہلاک کیا' انھوں نے لاکھوں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کیا' انھوں نے بوسنیا میں بدترین غیرانسانی نسل کشی کا ارتکاب کیا۔ اسرائیل وہ پہلا ملک ہے جس نے ۱۹۵۴ میں شام کا جہاز ہائی جیک کیا۔ یہی وہ سب سے پہلا ملک ہے جس نے اقوام متحدہ کے نمایندہ امن' کاؤنٹ برناڈوٹ (Count Bernadotte) کو ۱۹۴۸ میں قتل کیا۔ امریکہ اور اسرائیل دونوں نے ایران اور لیبیا کے مسافر بردار جہاز فضا میں تباہ کیے اور آزاد ممالک کی حکومتوں کو خفیہ آپریشن سے غیر مستحکم کیا اور ان کا تختہ الٹا۔ پھر بھی وہ عالمی امن و امان کے "مہذب" محافظ ہیں' ان کی شہنشاہوں کی طرح عزت کی جاتی ہے۔ دہشت گرد تو وہ قرار پاتے ہیں جو ان کی دہشت گردی کا شکار ہوتے ہیں' انھیں اپنی بے بسی اور غصے کے عالم میں کچھ نہ کچھ ان ہی کی طرح جواب دینے کی جرات کرتے ہیں۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ محاورے اور الفاظ کی طاقت (power of language) ان کی جیب میں ہے۔ دہشت گردی کے اول و آخر کا وہی تعین کرتے ہیں' ذرائع ابلاغ میں بھی اور نام نہاد علمی دنیا میں۔ کیمرے کی آنکھ اور قلم کی نوک سے ان کی تمام تر دہشت گردی کو "جوابی کارروائی" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ مظلوم (victims) بن کر سامنے آتے ہیں جب کہ دہشت گردوں کا مکمل تاثر اصل مظلومین پر' یعنی چھوٹے قزاقوں کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ دنیا دہشت گردی کے حوالے سے جو کچھ جانتی ہے' وہ وہی ہے جو ان مہذب قوتوں کی عینک سے نظر آتا ہے۔ مگر ایچ جی ویلز نے کس قدر صاف گوئی سے تہہ و بالا کر دینے والی سچائی کو بیان کیا ہے: "آج بھی یورپ کا رواج ہے کہ وہ رومی ادیبوں کی پیروی میں Huns اور ان سے وابستہ لوگوں کا ذکر کسی ناقابل یقین' تباہ کن اور ظالمانہ شے کی حیثیت سے کرتے ہیں--- رومی اپنے دشمنوں کے متعلق بلاجھجک اور بھرپور اتنا جھوٹ بول سکتا ہے جس پر جدید پروپیگنڈا کرنے والے افراد کو لازماً حسد ہو"۔ مگر افسوس کہ جدید دنیا نے رومی طرز عمل کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے' خصوصاً جب کہ معاملہ مسلمانوں' عربوں یا فلسطینیوں کا ہو۔

شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ کوئی میڈیا مین اور اسکالر جھوٹ کے اس فریب کو توڑ کر باہر نکل آئے۔ بدقسمتی سے Yonah Alexander اور Brigitte Nacos بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ معروضی جائزہ لیتے اور سچ کو آشکار کرتے' انھوں نے ادھورا سچ' من گھڑت باتیں' پروپیگنڈا اور وہی ایک

جیسی باتیں جو صبح و شام بیان کی جاتی ہیں' ان کو دہرانے کو ترجیح دی۔ یہ باتیں اس قدر عام ہیں کہ انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

امریکہ اور اسرائیل کی دہشت گردی کا یہ وہ اصول ہے جسے الیگزنڈر نے دیانت داری سے اپنی کتاب' "Middle East Terrorism" میں ۲۷ مضامین میں یکجا کر کے واضح کر دیا ہے۔ کتاب کا آغاز دہشت گردی کا سرا' قرون وسطی میں اسماعیلی قاتلوں سے جوڑنے سے ہوتا ہے۔ لیکن روسی قبضے کے خلاف یہودیوں کی دہشت گردی کا کوئی ذکر نہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کے دور کو مشرق وسطی میں ظالمانہ' ادارتی اور عالمی دہشت گردی کا دور کہا گیا ہے لیکن یہودی Stern اور Irgun گینگ کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں لکھا گیا۔ صرف ایک مضمون' Jewish Group' سٹرن دہشت گرد گروہ کے بانی پر ہے اور وہ بھی تعریفی ہے۔ دوسری طرف اسرائیل کا مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں اور عربوں پر مظالم کا سلسلہ اور دہشت گرد کارروائیاں اور لبنان اور تیونس میں کھلی دہشت گردی سے مکمل طور پر صرف نظر کیا گیا ہے۔ اسرائیل پر جو تین مضامین ہیں وہ بھی اس کی نام نہاد "جوابی کارروائی" پر ہمدردانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔

تاہم "مسلم بنیاد پرست" انتہائی خطرناک دھمکی کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ تمام کے تمام چھ مضامین نامکمل معلومات' ادھورے سچ' ناقص تجزیوں اور حد سے بڑھتے ہوئے تعصب پر مبنی ہیں' مثلاً ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۳ کو امریکی بحری ہیڈ کوارٹرز بیروت پر بمباری کو دہشت گردی کی نمایاں کارروائی کے طور پر دکھایا گیا ہے لیکن یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ ان کی ۱۹۶۸ سے ۱۹۸۵ تک وہاں موجودگی کا کیا اخلاقی جواز ہے؟ اسرائیل پر کیے جانے والے ۵۴۸ حملوں کے مقابلے میں اسرائیل کے ۳۵۰ جوابی حملوں کو ڈھٹائی کے ساتھ غیر متناسب قرار دیا گیا ہے لیکن جوابی حملوں کے بڑے پیمانے پر ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ آنکھ کے بدلے ایک آنکھ نہیں' بلکہ دو آنکھیں بلکہ سر بھی' ایک آنکھ کے بدلے!

ناؤکس (Nacos) کو "Terrorism and the Media" میں اس بات پر تشویش ہے کہ میڈیا کی دہشت گردوں کو کوریج دینا' انھیں عوام اور پالیسی سازوں پر گرفت مہیا کرتا ہے' جو وہ چاہتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح رکنا چاہیے۔ لیکن ان کی تشویش بے جا (misplaced) ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کی مالک کیتھرین گراہم نے بڑا صحیح کہا ہے: "پبلسٹی دہشت گردوں کے لیے آکسیجن ہے۔ لیکن میں یہ کہتی ہوں: خبر' آزادی کے لیے آب حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر دہشت گرد ہمیں آزادی سے محروم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی یہ فتح اس سے بڑی ہو گی جس کا وہ کبھی تصور کر سکتے ہیں اور اس سے بہت بدتر ہو گی جس کا ہمیں خدشہ ہے۔ آیئے اسے کبھی پورا نہ ہونے دیں"۔ تاہم گراہم کے معصومانہ اعلان کے باوجود' اسلام اور عربوں کے حوالے سے میڈیا کے انتہائی متعصب اور بدنیتی پر مبنی رویے کو مستند حوالوں سے بہ کثرت

مطالعات میں جمع کر دیا گیا ہے۔

بغیر کسی معروضی' غیر متعصب' متوازن' تحقیق و تجزیہ کے اور اساسی نظریات کو بخوبی جانے بغیر کوئی بھی حل تلاش نہیں کیا جا سکتا' چاہے کسی بھی قسم کی دہشت گردی ہو۔ اس لیے یہ نام نہاد دہشت گردی اصل مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو شہنشاہوں کی عالمی بالادستی ہے جو چھوٹے قزاقوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی چھوٹی کشتیوں کے ساتھ وسیع سمندروں میں آئیں' اور پکڑے جائیں اور الزام لگانے والوں کے سامنے دہشت گرد قرار پائیں۔

[خرم مراد۔ مسلم ورلڈ بک ریویو' ۱۷' نمبر ۴' ۱۹۹۷' ترجمہ: امجد عباسی]

مطبوعات موصولہ

○ **پیغمبرانہ دعائیں**' ڈاکٹر خالد علوی۔ مجید بک ڈپو' لاہور' فیصل آباد۔ صفحات: ۲۶۸۔ قیمت: ۶۰ روپے۔ (آداب دعا' قبولیت دعا' قرآنی دعائیں' حدیث کی دعائیں' نماز کے بعد کی دعائیں' متفرق جامع دعائیں--- دعاؤں کے متن پر اعراب کا اہتمام' حوالوں کا اہتمام--- ایک مفید و نافع کتاب)۔

○ **اسلامک موومنٹ** (ماہوار)' مدیر: محمد لیئین فلاحی۔ سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا۔ خاص شمارہ اگست ۱۹۹۷۔ صفحات: ۵۶۔ قیمت: ۸ روپے۔ (لاہور کے "ہم قدم" کے اسلوب پر طلبہ کا ترجمان۔ جملہ مسائل اور اپنا موقف کھل کر اور جرات مندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے' طباعت عمدہ)۔

○ **کرنیں**' اول۔ مقصود احمد۔ تعمیر ملت فاؤنڈیشن۔ مکان ۱۵ گلی ۱۵' ایف ۸/۳ اسلام آباد۔ قیمت: ۳۰ روپے۔ (بچوں کے لیے اسلامی و پاکستانی تناظر میں لکھی گئی نظموں کا انتخاب)۔

○ **RAYS**' مرتب' ناشر اور قیمت: مذکورہ بالا--- (بچوں کے لیے منتخب انگریزی نظمیں)۔

○ **خطابات قومی اسمبلی**' چودھری نذیر احمد خاں' سابق ایم این اے۔ ناشر: احمد حبیب سامان بھوپال والا' ضلع سیالکوٹ۔ (اسمبلی میں رکنیت کے زمانے کی تقریریں اور بحثیں--- انداز مصنف نے اپنے تئیں حق نمایندگی ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی--- آنے والوں کے لیے نشان راہ)۔

○ **منشورات**' منصورہ' لاہور کی درج ذیل کتب:

۱۔ **حاصل**' مظفر بیگ' صفحات: ۲۰۰' قیمت: ۷۵ روپے۔

۲۔ **عنایتیں کیا کیا**' عنایت علی خان' صفحات: ۳۱۶۔ قیمت: ۱۳۵ روپے۔

۳۔ **خرم مراد' حیات و خدمات**' صفحات: ۵۰۰۔ قیمت مجلد: ۲۰۰ روپے۔

ترجمان القرآن کے جنوری تا دسمبر کے مضامین کا اشاریہ ماہ دسمبر میں دیا جاتا تھا۔ یہ اس شمارے میں نہیں دیا جا رہا ہے۔ آیندہ ماہ جنوری ۹۸ میں ملاحظہ فرمایئے۔ (ادارہ)

مدیر کے نام

سلیم منصور خالد ' گوجرانوالہ

اقبال کا پیغام (نومبر ۹۷) خوب ہے' مگر خوب تر ہو سکتا تھا اگر ضمنی سرخیاں دی جاتیں اور نثر اقبال سے بھی تائید فراہم کی جاتی۔ نوادرات مودودی دراصل حکمت مودودی ہی ہے۔ شاعر کے حالات بھی ہوتے تو بہتر ہوتا۔ پھر بھی' نوجوان مودودی کی اس تازہ تحریر نے خوب لطف دیا۔ "غیر ملکی امداد کی تباہ کاریاں" بھی چشم کشا ہے۔ دوسرے ملکوں کا خصوصاً پاکستان کا معروضی مطالعہ کسی کو کرنا چاہیے۔ "قدرت کی ستم ظریفی" (کتاب نما' طارق جان) کی اصطلاح کا استعمال مناسب نہیں لگا۔ حق تعالیٰ تو ستم ظریف نہیں۔

محمد طاہر ' لال قلعہ ' دیر

معاشرے میں برائی سے ٹکر لینے کے لیے اسلحے کے بعد موثر ہتھیار مدلل اور پرشکوہ طرز تخاطب ہے۔ لمحہ فیصل (اعجاز فاروق اکرم' نومبر ۹۷) میں خیال کی لہر اس منظر تک پہنچ جاتی ہے جب حق و باطل برسرپیکار تھے اور قائد انقلاب پیش قدمی کر رہا تھا۔ شمع ہدایت' تاریکیوں کو منور کر رہی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے کو جلا مل رہی تھی۔ ترجمان القرآن کی سب ہی تحریریں خوب ہوتی ہیں مگر یہ بہت خوب تھی۔ زیادہ پسند آئی۔

عبدالرشید عراقی' سوہدرہ' گوجرانوالہ

لمحہ فیصل اس شمارے کی جان ہے۔ کتب سیرت میں رسول اللہ کے بے شمار خطبات محفوظ ہیں۔ اگر اس طرح دوسرے خطبات بھی دیے جائیں تو قارئین کے لیے بہت مفید ہو گا۔

محمد اسحق منصوری' کراچی

اسلامی بنک کاری : سہ طرفہ شراکت کا تصور (نومبر ۹۷) میں عبدالرحمن الکاف نے عملی مشکلات اور پیچیدگیوں کی طرف توجہ دلائی ہے' ان پر پیش رفت کی ضرورت ہے۔ معیشت کے ساتھ' سیاسی مسائل مثلاً طریق انتخاب وغیرہ میں دینی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ رسائل و مسائل میں مولانا گوہر رحمن اور ڈاکٹر انیس احمد کے جوابات سے قدیم و جدید کا جو امتزاج ہوا ہے' خوش آیند ہے۔ اعلیٰ معیار کا ایسا مرکز علمی ہماری ضرورت ہے جہاں قدیم و جدید علوم میں اجتہادی شان رکھنے والے علماے کرام اور اسکالرز جمع ہوں۔

عثمان عباسی ' لاہور

آپ کے حلقہ قارئین کی وسعت کا تقاضا ہے کہ زبان عام فہم اور سہل ہو' تب ہی ابلاغ موثر ہو سکے گا۔ مشکل تراکیب اور الفاظ کے ساتھ معنی بریکٹ میں دینے کا طریقہ اپنایا جائے تو نہ صرف قاری نئے لفظ سے آشنا ہو گا بلکہ معلومات میں بھی اضافہ ہو' مثلاً (نومبر ۹۷ میں) تفلسف (فلسفیت' حکمت)' نقیض (برعکس / ضد)' نقیضین (جمع نقیض) سفسد (وہم پر مبنی فلسفہ) وغیرہ۔

ابو یاسر ' اسلام آباد

شمارہ نومبر بہت ہی عمدہ ہے' مضامین میں تنوع ہے' پھر ایک اختلافی مسئلے پر دو آرا کا اظہار بہت اچھا لگا۔

87

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔اے ذیلدار پارک '' اچھرہ '' لاہور سے شائع کیا

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,